OCTOBER
2023

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

محترمہ نیلم احمد بشیر، جناب شہزاد نیئر، محترمہ رخشندہ نوید، جناب زاہد حسن، جناب غلام حسین ساجد

(پنجابی ناول مور بلیندہ کی تقریبِ رونمائی)

محترمہ سلمیٰ اعوان چائنہ ٹور

محترمہ سلمیٰ اعوان، جناب نوبی (مصری قونسلیٹ) اور محترمہ بشریٰ رحمٰن

جناب ابصار عبدالعلی اور محترمہ سلمیٰ اعوان

غزل

وہ وصل کی تھیں ، یا ہجر کی برساتیں
یہ ایک سے حیلے تھے ، کس ربط کی سوغاتیں

یہ رنگ محبت کے کس شہر میں بستے تھے
کِس دل میں ہیں وہ گلیاں کس دن کی ہیں یہ باتیں

کس دیس سے آتی ہیں کس دیس میں جانے کو
اَے مُہر بہ لب رستو ، یہ مُہر بہ لَب راتیں

سوچوں کے لیے کفنی ، جیبھوں کے لیے پھندے
یہ تانت بھی ہم ڈالیں ، یہ سُوت بھی ہم کاتیں

ہر دُور میں ، ہر پَل میں ، جولاں ہیں لہُو بن کر
لمحات میں جیتی ہیں حالات زدہ ذاتیں

کھلتا ہی نہیں خالد یہ قُفل ہم آہنگی
یہ مات بھری جیتیں ، یہ جیت بھری ماتیں

خالد احمد

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL	Freight Forwarding	Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

■ **Karachi:** (021) 34541301-7 ■ **Lahore:** (042) 36363300-7
■ **Sialkot:** (052) 3554301-6 ■ **Rawalpindi/Islamabad:** (051) 5162704-5
■ **Faisalabad:** (041) 8542924 ■ **Peshawar:** (091) 5606565 ■ **Multan:** (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا شمارہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 31 - اکتوبر 2023 - شمارہ نمبر: 10

ایڈیٹر: عمران منظور

مجلس ادارت

اعجاز رضوی	نعمان منظور	نوید صادق	کنور امتیاز احمد	جاہد احمد

تزئین و آرائش: ہیثم عمران

کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق: ملیحہ اعوان

پنجابی ناول مور یلدو کی تقریب رونمائی کے مقررین

قیمت: 100 روپے

سالانہ زر اعانت 1000 روپے بیرون ملک 100$ پاکستانی روپے میں

فیصل بینک لمیٹڈ

ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور

اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلیکیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور- 53700

فون: 3-37513000-42-92 فیکس: 37512517-42-92

Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ
www.trackntie.com
BAYAZ

عمران منظور ایڈیٹر، پبلشر اور پرنٹر نے زیک لمیٹڈ ملٹی پرنٹرز 16 کلومیٹر ملتان روڈ پلاٹ اطہر شہید روڈ ملتان روڈ سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تُو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	حسن عسکری کاظمی، نسیم سحر، فیض رسول فیضان، سرور حسین نقشبندی	7 تا 10
2	نعت	جلیل عالی، حسن عسکری کاظمی، سید ریاض حسین زیدی، نسیم سحر، محمد انیس انصاری، خاور اعجاز، سرور حسین نقشبندی، نبیل احمد نبیل، اسد رضا سحر، جنید نسیم سیٹھی، جمیلہ منیر	11 تا 21
3	عقیدت	خاور اعجاز، زاہد فخری، آفتاب خان، مرزا آصف رسول	22 تا 25
4	رباعیات	گلزار بخاری	26
5	گوشہ سلمیٰ اعوان	سلمیٰ اعوان کی تصانیف پر مضامین احمد ندیم قاسمی، ظفر اقبال، الطاف حسن قریشی، کشور ناہید، محمد اجمل نیازی، یونس جاوید، محمد حمید شاہد، انور سن رائے، نعمان منظور، سعدیہ قریشی، غلام محی الدین، الطاف فاطمہ، دردانہ نوشین خان، نرجس ملک	27 تا 51
		افسانہ سلمیٰ اعوان	52 تا 57
6	آپ بیتی	شوکت علی شاہ	58 تا 66
7	افسانے	حنیف باوا، فرخندہ شمیم، ثمینہ سید، اقبال خان یوسف زئی، عطا السلام سحر، راحیلہ خورشید، محمد علی نجیب	67 تا 91

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
8	غزلیں	خالد احمد، مرتضیٰ برلاس، جلیل عالی، حسن عسکری کاظمی، محسن اسرار، سید ریاض حسین زیدی، نسیم سحر، گلزار بخاری، خاور اعجاز، محمد انیس انصاری، باقی احمد پوری، اسلام عظمی، راحت سرحدی، مسعود احمد، مقصود جعفری، سعداللہ شاہ، عقیل رحمانی، اقبال سردیہ، رضا اللہ حیدر، عاصم اعجاز، دانش عزیز، انصر حسن، افتخار شاہد، رخشندہ نوید، آفتاب خان، اعجاز روشن، افتخار شوکت، ہمایوں پرویز شاہد، فیض رسول فیضان، طالب انصاری، حسنین سحر، شاہد ماکلی، ریاض ندیم نیازی، خالدہ انور، اوصاف شیخ، علی حسین عابدی، رانا غلام محی الدین، نبیل احمد نبیل، اظہر عباس، نعیم رضا بھٹی، ملیحہ سید، محمود کیفی، فیصل زمان چشتی، اکرم جاذب، اجمل اعجاز، محمد افضال انجم، محمد اشفاق بیگ، نائیلہ راٹھور، زبیر خیالی، عمران اعوان، سعدیہ بشیر، رخسانہ سمن، زاہد خان، علمدار حسین، مستحسن جامی، راجہ عبدالقیوم، عزیز عادل، احمد سجاد بابر، مرزا سکندر بیگ، عقیل عباس، بشیر احمد حبیب، شاہد فرید، صغیر احمد صغیر، ظہور چوہان، فرح رضوی، افضل ہزاروی، راول حسین، امجد ہزاروی، ردا حاصل خلوص، قمر نیاز، خالق آرزو، فخر عظیم، نعمان محمود، مہر علی، انصر رشید انصر، انور شیرازی، محمد علی ایاز، ابوبکر المشرقی، شفقت حسین شفق، ساگر حضور پوری	92 تا 169
9	مضامین	خواجہ محمد زکریا، سید افسر ساجد، نبیل احمد نبیل، گل اکبر خان، رانا محمد شاہد، رانا ساجد فراز	170 تا 206
10	طنز و مزاح	شاہد بخاری، حماد ریاض، اعجاز رضوی	207 تا 214
11	ماہیے، قطعات، ہائیکو	سیما پیروز ، عاصم بخاری ، محمد طلحہ غفور	215 تا 217
12	نظمیں	سید فخر الدین بلے، سید افسر ساجد، جلیل عالی، آصف ثاقب، سید ریاض حسین زیدی، خاور اعجاز، نسیم سحر، اکبر منیر، گلزار بخاری، ازھر منیر، شاہین عباس، اویس الحسن، فرخندہ شمیم ، اوصاف شیخ، سرور حسین نقشبندی ، امجد بابر ، نائلہ راٹھور ، غلام مرتضیٰ کوکل گل، شہاب اللہ شہاب ، اسامہ احمد، اعجاز رضوی	218 تا 241

حمد

وہ پھول جو وجدان کے صحرا میں کھلا ہے
اس پھول کی خوشبو کے تعاقب میں ہوا ہے

کہیے کہ قریبِ رگِ جاں ہے وہی جاناں
وہ شوخ ہے ایسا جسے دیکھا نہ سُنا ہے

کلیوں کا تبسم بھی تو مسکان ہے اس کی
دیکھا تو وہی پھول کے پردے میں چھپا ہے

ادراک کی لہروں میں رواں ہے وہ ازل سے
وہ خون میں شامل ہے مگر پھر بھی جدا ہے

پہنچا ہے سرِ عرش تصور کا پرندہ
یہ قوتِ پرواز بھی خالق کی عطا ہے

یہ سوچ کے رکھا ہے قلم ہاتھ سے میں نے
کیا حمد ہو اس کی جو دو عالم کا خدا ہے

کھل جائے حسن کا یہ عقیدہ بھی جہاں پر
بندوں سے محبت مرے خالق کی رضا ہے

حسن عسکری کاظمی

حمد

جو تیرا دھیان آیا، ہاتھ باندھے
زمیں پر سَر جھکایا، ہاتھ باندھے

جونہی تُو نے بلایا، ہاتھ باندھے
ترے در پر میں آیا ہاتھ باندھے !

مجھے محشر میں تُو رُسوا نہ کرنا
میں حاضر ہوں خدایا، ہاتھ باندھے !

مرے ہاتھوں میں تھا اِک جام، لیکن
حرم کا دھیان آیا، ہاتھ باندھے

مَیں کیسی گمرہی میں مبتلا تھا!
جو پلٹی میری کایا، ہاتھ باندھے

ہوئی جب حاضری مکّے میں میری
تو اپنا بُت گرایا، ہاتھ باندھے

مرے آقاؐ نے جب رستہ دکھایا
تو پھر وعدہ نبھایا، ہاتھ باندھے

نسیم سحر

حمد

ڈوبا ہوا جنون ہے بحرِ وجود میں
فکرِ مآل، عشق کی جاں کا وبال ہے
بھٹکی ہوئی خرد ہے غبارِ شہود میں
اور حسنِ بندگی ہے مگن کھیل کود میں

وہ لامکاں ہے اور تعیّن سے پاک ہے
فیضانؔ چُھپ کے یادِ الٰہی میں کر بسر
واعظ کرے ہے جس کو مقیّد حدود میں
اُلجھا ہوا ہے کس لئے ذوقِ نمود میں

کعبہ بھی ہے اُسی کی تمنا میں خاک بوس
ہم جس کو ڈھونڈتے ہیں رکوع و سجود میں

اپنا جواب آپ ہے عفو و کرم میں وہ
اُس کی کوئی مثال نہیں فضل و جُود میں

شعلے میں جس کا جلوۂ پُرنور ہے نہاں
اے بے خبر! اُسی کی تو چشمک ہے دُود میں

ہر درد کی دوا بخدا ہے سپاس و حمد
ہر روگ کا علاج ہے ذکر و درود میں

ہر امرِ حق ہے مخزنِ حکمت لئے ہوئے
ہے کوئی بات کشمکشِ ہست و بُود میں

فیض رسول فیضان

حمد

تار علم و ہنر کے بُن مولا
مجھ میں کوئی نہیں ہے گُن مولا

جن کا مقصود ہو رضا تیری
ایسے بندوں میں مجھ کو چن مولا

اہل ایماں کو سرفرازی دے
تیری طاقت ہے حرفِ کن مولا

ہم تو غفلت میں سوئے ہوتے ہیں
جب برستا ہے تیرا ہن مولا

دھیان میرا ہٹا کے دنیا سے
صرف اپنی لگا دے دھن مولا

جن کے صدقے یہ کائنات بنی
ان کے صدقے مری بھی سن مولا

اپنے سرور کے دل کو اُجلا دے
معصیت کا لگا ہے گھُن مولا

سرور حسین نقشبندی

نعت

اُسؐ سے وابستہ اگر قلب و نظر ہو جائیں
دُور سینے سے سبھی دہر کے ڈر ہو جائیں

اُسؐ کی یادوں سے نمو پائے نہالِ احساس
اُسؐ کی فرقت میں بہے اشک گہر ہو جائیں

رہے دھیان اس مہِ دوراںؐ کا ہر اک سانس کے ساتھ
اِسی دُھن میں سبھی دن اپنے بسر ہو جائیں

نقشِ پا اُسؐ کے بنا لیں جو نشانِ منزل
سنگ بھی اُن کو عدو کے گلِ تر ہو جائیں

تھام لیں اُسؐ کا جو دامن تو ملے غم سے نجات
نام لیں اُسؐ کا تو دیوار میں در ہو جائیں

اُسؐ کے عشاق دل آنکھوں سے اسےؐ دیکھتے ہیں
جس طرف اُسؐ کا اشارہ ہو اُدھر ہو جائیں

اُسؐ کی رحمت ہے کہ روشن ہیں ابھی ارض و سما
ورنہ بے نور نہ یہ شمس و قمر ہو جائیں

یہ بھی اعجاز ہے اُس حسنِ ابد کا عالی
اُسؐ کی مدحت میں لکھے لفظ امر ہو جائیں

جلیل عالی

نعتؐ

یہ حرفِ نعت معجزہ اُنؐ کی عطا کا ہے
لوحِ نظر پہ حاشیہ ذوقِ ثنا کا ہے

اوصافِ مصطفیٰؐ کے ہیں پرچم کھلے ہوئے
میری زباں پہ ذکر حبیبؐ خدا کا ہے

آنسو بہائے بخششِ امت کے واسطے
خیرِ عمل تمام یہ بحرِ سخا کا ہے

ہم کو بچا لیا ہے طلب کے عذاب سے
دیکھا کہ یہ نتیجہ بھی اُنؐ کی دعا کا ہے

کام آگئی ہمارے شفاعت حضورؐ کی
اب انتظار ہم کو بھی روزِ جزا کا ہے

صد شکر ہے کہ دامنِ رحمت میں آگئے
جو اعتبار حشر میں سب انبیاء کا ہے

ہم پر ہے فرض آلِؑ پیمبرؐ سے دوستی
حق ہے کہ یہ تقاضا بھی ان سے وفا کا ہے

حسن عسکری کاظمی

نعتؐ

برتر از وہم و گماں ذات آپؐ کی
باعثِ تسکینِ جاں ذات آپؐ کی

ہے معطر ہر گل و برگ و گیاہ
اک مہکتا گلستاں ذات آپؐ کی

رفعتیں ، گہرائیاں ، پہنائیاں
ایک بحرِ بے کراں ذات آپؐ کی

بندگی خالق کی رہ پر آگئی
منزلِ راحت نشاں ذات آپؐ کی

ذرے ہم دوش ثریا آپؐ سے
بے کسوں پر مہرباں ذات آپؐ کی

چلچلاتی دھوپ میں سایہ فگن
موجبِ حفظ و اماں ذات آپؐ کی

دین و دنیا کی حقیقت آپؐ ہیں
ہے رگِ جاں میں رواں ذات آپؐ کی

مشرق و مغرب میں چرچا آپؐ کا
شش جہت میں جاوداں ذات آپؐ کی

منزلِ اخریٰ نظر میں آگئی
ہے جو میرِ کارواں ذات آپؐ کی

خالق و مخلوق میں قرب آپؐ سے
ایک پل ہے درمیاں ذات آپؐ کی

گل فشاں ہیں آپؐ سے سب عرش و فرش
ہے ریاضِ لامکاں ذات آپؐ کی

سید ریاض حسین زیدی

نعتؐ

مدینے سے بُلاوا جونہی آیا
کہا یہ: 'بس مَیں آیا' ہاتھ باندھے

جب اُس دربار میں حاضر ہوا مَیں
تو مَیں نے سر جھکایا، ہاتھ باندھے

گیا جب بھی نبیؐ کے شہر میں مَیں
دِیا دل کا جلایا ، ہاتھ باندھے

لگا جب یہ ، دُعا مقبول ہو گی
میں دل میں مسکرایا ہاتھ باندھے

کہا صلِ علیٰ جب صدق دِل سے
مرا دل جگمگایا ، ہاتھ باندھے

یقیں جب ہو گیا اپنے نبیؐ پر
سرِ دربار آیا ہاتھ باندھے

نسیم سحر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اے ماحیٔ غمِ دل و دنیا! ترے لیے
محوِ دعا رہے رُسلِ ذوالمنن تمام

نعتؐ

درِ نبیؐ پہ کھڑا ہوں ، حضورؐ سامنے ہیں
میں جیسے دیکھ رہا ہوں ، حضورؐ سامنے ہیں

صحابیوںؓ کی صدائیں سنائی دیتی ہیں
جہاں میں آ کے رُکا ہوں ، حضورؐ سامنے ہیں

میں عمر بھر اِسی لمحے کی آرزو میں جیا
اُس آستاں پہ پڑا ہوں ، حضورؐ سامنے ہیں

بندھے ہیں ہاتھ ، زُباں مُنگ اور سَر خم ہے
غلام جیسا کھڑا ہوں ، حضورؐ سامنے ہیں

خدا کا شُکر ہے ، میرا سفر تمام ہوا
جہاں میں تھک کے گرا ہوں ، حضورؐ سامنے ہیں

یہ جالیاں ، مرے جیون کا آخری منظر
سو اب میں بجھنے لگا ہوں ، حضورؐ سامنے ہیں

انیسِ جاں! یہی ٹکڑا ریاضِ جنت ہے
جہاں پہ محوِ ثنا ہوں ، حضورؐ سامنے ہیں

محمد انیس انصاری

نعتؐ

ہیں دونوں جہاں جس سے روشن وہ سبب کیا ہے
اِک اسمِ محمدؐ ہے اور اُس کا اُجالا ہے

جو شب کا مسافر ہے اُس پر ہے ضیا تیریؐ
جو دھوپ کا راہی ہے اُس پر ترا ؐ سایا ہے

محرابِ فلک پر ہیں لاکھوں ہی دِیے لیکن
ذرّہ ترےؐ قدموں کا مِرا شوق ستارا ہے

اِک ساعتِ ہجرت سے صدیاں مِری وابستہ
اِس وقت کے لقمے میں مِرا کُل سرمایا ہے

ہم خیمۂ امکاں میں بیٹھے ہیں دھواں اوڑھے
اُسؐ مہرِ توجہ سے منظر یہ بدلنا ہے

ہم راہِ حرا میں ہوں جب عمر کی شام آئے
ترےؐ چاہنے والوں کی یہی ایک تمنا ہے

یہ شہرِ مدینہ ہے اور آگے نہیں جانا
اے موجِ نفس ہم نے بس اَب یہیں رُکنا ہے

خاور اعجاز

نعت

دعا کو ہاتھ اٹھاتا ہوں پھر یقین کے ساتھ
درود پڑھتا ہوں ''ایاک نستعین'' کے ساتھ

نبی کا نام لبوں سے ادا ہوا تو لگا
کہ تر ہوئی ہو زباں جیسے انگبین کے ساتھ

کبھی بٹھاؤ محبت سے اپنے پاس انھیں
مرے رسول کی نسبت ہے مفلسین کے ساتھ

جہاں میں کذب وخیانت سے جانے جاتے ہیں
جڑے ہیں کہنے کو ہم صادق وامین کے ساتھ

یہ اس کا فیض ہے بیٹھا ہوا ہوں مسند پر
میں بیٹھا کرتا تھا محفل میں سامعین کے ساتھ

مجھے یقین ہے چمکے گی حشر میں سرور
کہ خاکِ طیبہ لگی ہے مری جبین کے ساتھ

سرور حسین نقشبندی

نعتؐ

جتنے ہیں حضرتِ انساں کے بھرم تیرے ہیں
عرش کو چھو کے جو لوٹے وہ قدم تیرے ہیں

کس لیے گرمیِ محشر کا کوئی خوف کریں
ہم کو کیا ڈر ہے قیامت کا کہ ہم تیرے ہیں

صرف تیرے لیے تخلیق ہوئے عالمِ کُل
یہ زمیں اور فلک شاہِ اُمم تیرے ہیں

معتبر ہم ہیں اگر عہدِ ستم پرور میں
یہ سبھی فیض ہے تیرا یہ کرم تیرے ہیں

آج بھی ظُلمتِ بے رنگ میں سورج کی طرح
جس طرف دیکھیں ضیا بار علَم تیرے ہیں

جس قدر میری نمازیں ہیں ترے نام کی ہیں
جتنے سجدے بھی جبیں پر ہیں رقم تیرے ہیں

میں نے دیکھی ہے بہت چھان پھٹک کر دُنیا
تذکرہ تیرا ہے موجود و عدم تیرے ہیں

نعمتیں تجھ کو میسّر ہیں سبھی قُدرت کی
جس قدر اُس کے ہیں سب ناز و نعم تیرے ہیں

کہتا پھرتا ہے زمانے سے یہی روز نبیلؔ
آنکھ کا نور مرے سینے میں دَم تیرے ہیں

نبیل احمد نبیل

نعتؐ

خالق نے بنائی ہے تری ذات مکمل
بن تیرے کہاں ہوتی ہے صلوات مکمل

اوصاف چنے آپؐ کے آیات سے میں نے
پھر جا کے ہوئی مجھ سے یہ اک نعت مکمل

جب تک نہ کیا ذکر تمہارا شہِ بطحا
ہو پائی نہیں مجھ سے کوئی بات مکمل

تخلیق کیا رب نے ترے نور کو پہلے
پھر کرتا رہا بعد میں دن رات مکمل

نعت کا تصور بھی ادھورا تھا جہاں میں
آنے سے ہوئیں آپؐ کے نعمات مکمل

اسد رضا سحر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

تو نے ہر ذرّے کو سورج سے ہم آہنگ کیا
تو نے ہر قطرے میں اک بحر کی وسعت لکھی

نعتؐ

شاملِ حال اگر آپ کی رحمت ہو جائے
عرصۂ کرب میں حاصل مجھے راحت ہو جائے

لب پہ آ جائے جو ہنگامِ سحر آپ کا نام
دن کی ایک ایک گھڑی حاملِ برکت ہو جائے

آپ کے ذکر کی نسبت سے ملے دولتِ درد
مجھ سا نادار بھی کچھ صاحبِ ثروت ہو جائے

آپ کی سُنّتِ اطہر ہو مرے پیشِ نظر
میرا معیارِ حیات آپ کی سیرت ہو جائے

گُلشنِ فکر میں مدحت کا صنوبر لہکے
جس کی خُوشبو سے تر و تازہ طبیعت ہو جائے

بامِ اظہار پہ اُترے کسی شب نعت کا چاند
قریۂ حرف مُنور کسی صُورت ہو جائے

دل میں کچھ ایسے نمو پائے مدینے کا خیال
چشمِ مُفلس کو زرِ اشک عنایت ہو جائے

میں کہ بیمارِ معاصی ہُوں مگر آپ کا ہُوں
آپ جو چاہیں تو بہتر مری حالت ہو جائے

کھینچ لیتا ہوں دمِ مدح درودوں کا حصار
تا کہ کچھ عرضِ تمنا میں سہولت ہو جائے

نعت کی ذیل میں ہر لفظ امانت ہے جنید!
ڈر رہا ہُوں، نہ کہیں مجھ سے خیانت ہو جائے

جنید نسیم سیٹھی

نعتؐ

آپ پر ہے رحمتِ یزداں امام الانبیاء
آپ ہی کی شان میں قرآں امام الانبیاء

کیا مری مدحت نگاری اے حبیب ذوالمنن
جب خدا خود ہے ستائش خواں امام الانبیاء

رات دن تیرے ہی کوچے کی زیارت کی لگن
ہے یہی اس ذوق کا ساماں امام الانبیاء

آپ کے دیدار کی امید میں مدت سے دل
صورتِ آئینہ ہے حیراں امام الانبیاء

ہو شہا ناچیز پہ لطف و کرم کی اک نظر
یہ ! جمیلہ بھی ہے مدحت خواں امام الانبیاء

جمیلہ منیر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

چہرے پہ سایہ گر عجب ابرِ جمیل ہے
باغِ جناں ہے پرتوِ رُخ سے بدن تمام

عقیدت

کبھی یہ معجزۂ ماہ و سال ہو جائے
عظیم رفتہ نگہبانِ حال ہو جائے

وہ روشنی ہے مرے فکر و فن کے خیموں میں
جہاں بھی اُبھرے وہاں بے مثال ہو جائے

ہمیں نصیب ہو تطہیرِ فکر کی ساعت
ہوس کی قید سے جذبہ بحال ہو جائے

شجر کا ہاتھ نہ چھوٹے اگرچہ کانٹوں سے
لہو لہان بھی شاخِ مآل ہو جائے

حسینؓ آپ سے نسبت ہے جس روایت کو
خدا کرے اُسے حاصل کمال ہو جائے

خاور اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

تو نے ہر ذرّے کو سورج سے ہم آہنگ کیا
تو نے ہر قطرے میں اک بحر کی وسعت لکھی

عقیدت

ہزار شکر کہ شاعر بنا دیا تو نے
اور اس پہ نعت بھی کہنا سکھا دیا تو نے

سلیقہ تو نے دیا مجھ کو حمد لکھنے کا
کہ شکر کرتے ہیں کیسے بتا دیا تو نے

ترے کرم نے مجھے چھاؤں بانٹنی بخشی
زمینِ فکر پہ برگد اگا دیا تو نے

میں دشمنوں کو بھی دل سے دعائیں دیتا ہوں
لہو میں خیر کا چشمہ بہا دیا تو نے

مٹا دیئے مری دوری کے جتنے صدمے تھے
مرے تو دل میں مدینہ بسا دیا تو نے

درود پڑھ کے میں سویا تو وہ نظر آئے
سلا کے مجھ کو مقدر جگا دیا تو نے

وہ نور تھا کہ مرا خواب جگمگا اٹھا
زہے نصیب مجھے کیا دکھا دیا تو نے

زمین میری ہوئی آسمان میرا ہوا
جو درمیان تھا پردہ ہٹا دیا تو نے

یہ فخر کم ہے کہ فخری تھا خاک کا ذرہ
اسے فلک کا ستارہ بنا دیا تو نے

زاہد فخری

عقید

جینے کا مزا آئے سرکار کے سائے میں
میں زیست گزاروں گا کردار کے سائے میں

آقاؐ نے لگایا تھا اک باغ کھجوروں کا
اے بخت وہیں لے چل اشجار کے سائے میں

ہر وقت مرے لب پر بس اُنؐ کا درود آئے
یہ عمر کٹے انؐ کے افکار کے سائے میں

ہوتا ہے گزر ہر پل جنت کی ہواؤں کا
بیٹھا ہی رہوں انؐ کی دیوار کے سائے میں

وہ دور صحابہؓ کا ذیشان و معزز تھا
اے کاش میں رہتا اس دربار کے سائے میں

جو دینِ محمدؐ کے پتوار پکڑ لے گا
کشتی نہ گھرے اس کی منجدھار کے سائے میں

سرسبز فضاؤں میں آرام رہے دل کو
سوغات ہے خوشبو کی مینار کے سائے میں

سر اپنا کٹا دوں گا میں شانِ رسالت پر
ڈر مجھ کو نہیں لگتا تلوار کے سائے میں

آفتاب خان

کیفِ دروں

جو چاہو کیفِ دروں نعت کے قرینے میں
بڑھاؤ صَلِّ عَلٰی کا سرور سینے میں
دل و نظر کی وہ انگشتری ہے یادِ حبیبؐ
کہ ہو نظر سرِ خاتم تو دل نگینے میں
ہے ذکر انہی کا سدا ورنہ وقت کے ہاتھوں
وہ کیا ہے جو نہیں نسیان کے دفینے میں؟
سخن پہ فخر ہے پھر آسماں رسا کہ اگر
زمینِ طیبہ کے منظر ہوں اِس زمینے میں
کر اُن کی نذر وہی جو ہے خود کمایا ہوا
کہ حقِ نذر نہیں ہے کسی سے چھیننے میں
ربیع الاولِ میلاد سے ہو آگے بھی
وہ عشق جس کا چراغاں ہے اِس مہینے میں
تمام عمر اَطِیْعُوا الرَّسُوْل کا قرآں
وہ ہم نے رکھ لیا پڑھنے کو بس ثبینے میں
مقام انہی کی ہے نسبت سے اپنا ورنہ ہم
ہیں یونہی جیسے ہو معنیٰ بنا کوئی "نے، میں"
لگاؤ کفر پہ ایسی زدِ رَفَعْنَا لَكَ
رہے نہ زورِ اہانت کسی کمینے میں
دیارِ ساقیِ کوثر سے دور بے مایہ
میں کب تلک رہوں؟ حسرت کے اشک پینے میں
محاذ میرے ہی اندر ہے جو خلاف مرے
وہ مجھ سے ہوگا اگر ہوگا سر مدینے میں
دوامِ عشرتِ ہستی نبی سے عشق میں ہے
ہے ورنہ نقص فقط عمر کے خزینے میں
کروں گا پیش میں کیا ارمغاں انہیں، اے دل!
ہے میرا فقر ہی بس میرے آبگینے میں
ہے جسمِ نور میں کیا! شانِ اَیُّکُمْ مِثْلِی؟
نثار جس پہ ہوں گُل وہ مہک پسینے میں
نہ ہوتی جامۂ تہذیب پہ گر اُن کی نظر
حیات اُدھڑ گئی ہوتی خود اِس کو سینے میں
ہلاک زیست ہمیں کرتی موت سے پہلے
یہ شامل اُن کا کرم ہے ہمارے جینے میں
وہ اب بھی دیکھ تو لے نورِ اسمہ احمد
مگر ہے دیدۂ "دیوارِ گریہ" کینے میں
سوئے دَنٰی فَتَدَلّٰی ہیں آسماں کیا کیا!
نہ چھو سکے کہ خرد ہے خلا کے زینے میں
نہیں ہے سیلِ بلا کا کہیں بھی خوف آصف!
کہ دل ہے مصطفوی عشق کے سفینے میں

مرزا آصف رسول

رباعیات

اللہ کے ہی اسم سے آغاز کریں
الطاف و عنایات کا در باز کریں
ہے ذات ازل سے وہی رحمان و رحیم
اس کے ہی کرم سے سخن اعجاز کریں

.....

بندہ ہے خطاکار خطا کرتا ہے
خالق ہے کریم اس کا پتا کرتا ہے
دیتا نہیں اُڑنے کے لیے پَر خالی
پرواز کی طاقت بھی عطا کرتا ہے

.....

کیا تھا وہ سفر صرف سفر کی خاطر
مقصود رہا خیر و خبر کی خاطر
معراجِ محمدؐ سے یہی درس ملا
گردوں ہوا تسخیر بشر کی خاطر

.....

موجود و میسر سے پرے جاتے ہیں
الزام بھی قسمت پہ دھرے جاتے ہیں
اچھی نہیں لگتی ہمیں حاصل خوشیاں
نایاب لفائز پہ مرے جاتے ہیں

.....

یکجائی سہی فریب کاروں میں بہت
ہمت ہے مگر صدق شعاروں میں بہت
کیا فکر مقابل ہے اگر جم غفیر
اک شخص بھی ہوتا ہے ہزاروں میں بہت

.....

لگتا ہے یہ حالات کے پیرائے سے
آئے گا تغیر نہ کسی رائے سے
اخلاق و ذہانت سے وہاں کیا ہو گا
ہوتے ہوں جہاں فیصلے سرمائے سے

.....

حق دوست حقیقت کا پتا جانتا ہے
تو بندۂ نادان ہے کیا جانتا ہے
یا شانِ رسالت کی سمجھتے ہیں علی
یا رتبہ محمدؐ کا خدا جانتا ہے

.....

کیوں چل کے کسی اور طرف سے آؤ
تم سوئے شرف ، راہِ شرف سے آؤ
ہے علم کا دروازہ علی شہر نبی
منزل ہے مدینہ تو نجف سے آؤ

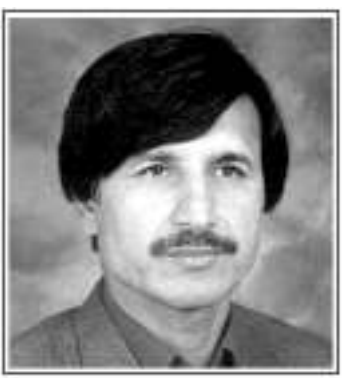

گلزار بخاری

بیچ بچولن

نئے سے نئے اہلِ قلم سے متعلق ہزار باخبری کے دعوے کے باوجود سلمیٰ اعوان کے افسانوں کے مجموعے ''بیچ بچولن'' کی اشاعت سے پہلے مجھے قطعی علم نہیں تھا کہ وہ افسانے بھی لکھتی ہیں۔ میں ان سے متعارف ضرور تھا کہ انھوں نے مشرقی پاکستان کے پس منظر میں جو ناول ''تنہا'' لکھا ہے وہ اس موضوع پر شائع ہونے والی ادب میں ایک سربرآوردہ حیثیت رکھتا ہے۔ پھر مجھے ان کی سفرنامہ نگاری کے بارے میں بھی علم تھا مگر اپنے رسالے ''فنون'' کی تاریخ کے گزشتہ ساڑھے اکتیس برس میں اگر میں نے کوئی ایک سو نئے افسانہ نگاروں کو اُردو دنیا سے متعارف کرایا تو اس طویل فہرست میں بھی سلمیٰ اعوان کا نام کہیں نہیں تھا۔ شاید اُنھوں نے اس کی ضرورت ہی محسوس نہ کی ورنہ اگر مجھے ان کے تخلیقی جوہر کے اس پہلو کا علم ہوتا تو ان سے ضرور رابطہ پیدا کرتا۔ جب یہ مجموعہ شائع ہوا تو مصنفہ نے مجھے ایک جلد سے نوازا مگر شاید کوئی مہربان تشریف لائے اور یہ کتاب میری بے خبری میں اُٹھالے گئے۔ یوں مجھ سے سلمیٰ کے افسانے پڑھنے کا موقع بھی چھن گیا۔ اب اس مجموعے کی افتتاحی تقریب میں شمولیت کے سلسلے میں سلمیٰ میرے ہاں تشریف لائیں تو میں نے

احمد ندیم قاسمی

ان سے کتاب کی گمشدگی کا ذکر نہیں کیا بلکہ طے کیا کہ کتابوں کے انبار میں سے ''بیچ بچولن'' تلاش کرلوں گا۔ ناکامی ہوئی تو دو چار ناشروں اور کتب فروشوں کے ہاں کتاب کے بارے میں پوچھا۔ یہ مجموعہ کہیں بھی دستیاب نہ ہوا تو مجبوراً میں نے مصنفہ کو فون پر اپنی مشکل بتائی۔ انھوں نے کرم کیا اور مجھے اس کتاب کی دوسری جلد مہیا کردی اور یوں میں اس قابل ہو سکا کہ سلمیٰ کے افسانوں کا مطالعہ کرلوں۔ میں نے اس دوران میں پوری کتاب پڑھ لی ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ سلمیٰ اعوان متعدد جہات سے ایک منفرد افسانہ نگار ہیں مجھے اس کا علم نہیں کہ ان کے افسانے کتابی صورت اختیار کرنے سے پہلے کہاں چھپتے رہے ہیں۔ کم از کم اِن معروف ادبی رسالوں میں تو نہیں چھپے جو میری نظر سے باقاعدگی سے گزرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اس پائے کے افسانوں کو ڈائجسٹوں اور اخبارات میں شائع کروا کے انھیں ایک طرح سے ضائع نہیں کرنا چاہیے تھا، البتہ ''بیچ بچولن'' کی اشاعت نے افسانوں کو تاریخ ادب کے آثار قدیمہ بن جانے سے بچا لیا ہے۔ مجھے ان افسانوں میں جو خصوصیت دوسری خصوصیات کے مقابلے میں بہت نمایاں محسوس ہوئی وہ سلمیٰ اعوان کے مشاہدے کی اتنی شدید...... بلکہ میں کہوں گا کہ اتنی خوفناک...... گہرائی ہے کہ جو بھی کردار ان کے سامنے آتا ہے اس کے ظاہری خدوخال سے زیادہ وہ اس کے باطن کا ایسا ایکس رے لیتی ہیں کہ کوئی رگ، کوئی نس، کوئی ورید پوشیدہ نہیں رہتی۔ انسانی کرداروں کے علاوہ مناظر و ماحول کی تصویرکشی میں بھی مشاہدے کا یہ کمال دکھایا گیا ہے اور یہ ایک ایسی خوبی ہے جس کی ہمارے ادب میں صرف ایک گھمبیر مثال راجندر سنگھ بیدی ہی کی پیش کی جاسکتی ہے۔ ان دس افسانوں کے کردار تو یقیناً متنوع ہیں اور کہیں بھی ایک کردار کسی دوسرے کردار کی کاربن کاپی نہیں بن سکا۔ مگر ان افسانوں کے موضوعات قریب قریب مشترک ہیں - یہ موضوعات رشتوں، ناتوں، منگنیوں، نکاحوں اور طلاقوں وغیرہ کے گرد گھومتے ہیں مگر موضوعات کی اس یکسانیت سے کسی ایک مقام پر بھی اکتاہٹ پیدا نہیں ہوتی اور سلمیٰ کا اسلوب اتنا رواں اور پُرکشش ہے کہ قاری پڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ خود میری مثال آپ کے سامنے ہے کہ میں گوناگوں مصروفیات اور عمر کے تقاضوں سے مجبور ہو کر ''فنون'' کے لیے آنے والے افسانوں کے مطالعے کا وقت ہی نہیں نکال سکتا سو دو تین اعلیٰ معیار کے ادب کا مطالعہ کرنے والے دوستوں سے کہتا ہوں کہ وہ یہ افسانے پڑھ کر ان کی

خوبیوں یا خامیوں کی نشاندہی کر دیں اور یوں میرا ہاتھ بٹائیں، مگر یقین کیجیے کہ سلمیٰ نے اپنا یہ مجموعہ مجھے 28 جولائی کو عنایت کیا اور میں نے 29 جولائی کا جمعہ اس کتاب کے مطالعے کے لیے وقف کر دیا اور دس کے دس افسانے پڑھ ڈالے۔ سلمیٰ کی فنی طلسم کاری نے مجھ سے اپنے یہ افسانے ایک ہی دن میں پڑھوا ڈالے ہیں تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس کے فن میں کوئی ایسا سحر، کوئی ایسا جادو ہے جو پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور صرف لے لیتا ہی نہیں، اپنی گرفت کو آخر تک برقرار رکھتا ہے۔ اس مجموعے کا پہلا افسانہ ''خبر ہونے تک'' بیک وقت دلآویز اور دلدوز افسانہ ہے مگر مجال ہے جو سلمیٰ کسی بھی مقام پر جذباتیت یا جذبات زدگی کا شکار ہوئی ہوں۔ یہی عالم مجموعے کے طویل ترین افسانے ''بیچ بچولن'' کا ہے جو کتاب کے چوالیس صفحوں پر محیط ہے۔ موضوع وہی رشتے ناتے ہی ہے مگر مجال ہے جو قاری نے افسانہ پڑھتے ہوئے کسی مقام پر ایک آدھ منٹ سستا لینے کا سوچا ہو۔ ہاں مجھے اس بھرپور افسانے پر یہ اعتراض ضرور ہے کہ آخر میں افسانہ نگار نے اس کے انجام کے بارے میں جو چار امکانات شامل کرنا ضروری سمجھے ہیں وہ قطعی غیر ضروری ہیں کیونکہ افسانہ تو وہیں ختم ہو جاتا ہے جہاں مرکزی کردار یہ الفاظ ادا کرتا ہے کہ ''میں اپنی تحلیل نفسی نہیں کر پاتی''۔ افسانہ ''آئینے میں'' مختصر افسانہ نویسی کا ایک شاہکار ہے۔ اسی طرح افسانہ ''شوپیس'' نہ صرف حد درجہ کامیاب افسانہ ہے بلکہ جس طرح کا کردار مصنفہ نے اس افسانے میں پیش کیا ہے اس کی کوئی دوسری مثال اُردو ادب میں پیش نہیں کی جا سکتی۔ سلمیٰ اعوان کا اندازِ بیان رواں اور زبان شستہ ہے۔ مکالمہ نگاری پر انھیں بے پناہ عبور حاصل ہے۔ خاص طور پر جب عورتیں آپس میں لڑتی جھگڑتی ہیں تو سلمیٰ کی مکالمہ نویسی میں حقیقت کے علاوہ طنز و مزاح کا ایک سیلاب اُمڈ آتا ہے۔ وہ پنجابی زبان کے بعض الفاظ اس سلیقے سے استعمال کرتی ہیں کہ ان الفاظ کو اُردو میں مستقلاً کھپا لینے کو جی چاہتا ہے۔ پھر وہ ایک وسیع المطالعہ فن کار ہیں چنانچہ ان کے افسانوں میں بڑی بڑی عالمی شخصیتوں اور بڑی بڑی سائنسی تھیوریوں کے حوالے جا بجا آتے ہیں مگر کہیں کھلتے نہیں۔ وہ افسانے کا ناگزیر حصہ معلوم ہوتے ہیں۔ سلمیٰ اعوان چند سلیس الفاظ میں پوری شخصیت کو پوری سہولت سے پیش کر دیتی ہیں۔ ان کے یہ الفاظ ملاحظہ ہوں۔ ''آنگن میں خالی پاؤں بھی چلتی تو جیسے گھنگرو بجتے تھے۔ چوڑے کے بغیر کلائیاں چھنکتی تھیں۔''

☆☆☆☆☆

عالمی ادب کی فروزاں قندیلیں

سلمیٰ اعوان کے سفرنامے پڑھ پڑھ کر ہی ہم پھاوے ہو چلے تھے کہ اوپر سے انھوں نے ایک نیا گل کھلا دیا ہے، اس کا ذکر بعد میں کریں گے، پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے عاشق بھی ہیں۔ وہ میری شاعری کی عاشق ہیں تو میں ان کی صحت مندی کا، جو اُن کی تحریروں سے چھلکی بلکہ پھٹی پڑتی ہے۔

اُن کی کتاب کا عنوان ہے ''عالمی ادب کی فروزاں قندیلیں'' جو کوئی ساڑھے تین سو صفحات پر محیط ہے، جسے پبلشنگ ہاؤس یونیورسٹی آف مینجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی لاہور نے چھاپا اور قیمت 750 روپے رکھی ہے۔ انتساب اس طرح سے ہے: ''ان اجنبی سرزمینوں کے نام جنھوں نے مجھے خوش آمدید کہا اور اپنے لعل و گوہر سے میرا تعارف کروایا۔'' ''پیش لفظ: ''آپ کی توجہ کی طالب'' کے عنوان سے مصنفہ نے خود لکھا ہے جن مشاہیر کے ذکر سے اس کتاب کے صفحے روشن ہیں، ان میں شاعر بھی ہیں، مغنی اور موسیقار بھی، نقاد اور فکشن رائٹر بھی۔ یوں سلمیٰ اعوان نے عالمی ادب کے سمندر کو ایک طرح کوزے میں بند کر دیا ہے۔ ان کا تعلق بیرونی دنیا کے مختلف ملکوں سے ہے۔ ان مصنفین کا تفصیلی تذکرہ اور ان کے فن اور زندگی پر اس کتاب میں بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے یعنی اس کتاب سے آپ دنیا بھر کے ادب اور ادیبوں سے خاصی حد تک روشناس ہو جاتے ہیں۔

اِن مشاہیر کے نام بالترتیب یہ ہیں: نزار قبانی، مونا عمیدی، بورس پاسترنک، الیگزینڈر سرگیووچ پشکن، لیوٹالسٹائی، اور صوفیہ ٹالسٹائی، دوستووسکی اور اینا دوستووکی، مولانا جلال الدین رومی، یونس ایمرے، رابندر ناتھ ٹیگور، کرونیرتن سکارا، سعدی یوسف، ابونواس، جرٹروڈ وبیل، جان کیٹس، گوزیو کاردوسی اور محمود درویش۔

☆☆☆☆☆

ظفر اقبال

''لہو رنگ فلسطین'' .....حرف کی خوشبو

محترمہ سلمیٰ اعوان کی ''لہو رنگ فلسطین'' جو تاریخ کے وہ گوشے بے نقاب کرتی ہے جو یا تو ہماری نظروں سے اوجھل رہے یا ہماری یادداشت سے محو ہوتے جا رہے ہیں۔ سلمیٰ اعوان جن کی سترہ تخلیقات منظر عام پر آ چکی ہیں۔ اُن کی تازہ تصنیف فلسطین کے بارے میں ہے جو اُردو ادب میں اپنی نوعیت کا پہلا عظیم ناول ہے کہ اِس میں تاریخ بھی ہے، عرب موسیقی کی دھنیں بھی ہیں، محبت کی داستانیں بھی اور وہ سازشیں بھی جو یہودی ریاست کے قیام کے سلسلے میں عرصہ دراز سے ہوتی آئی ہیں جن سے فلسطین ایک آتش کدے میں تبدیل ہو گیا ہے اور مسلمان، یہودی، عیسائی اور آرمینائی جو صدیوں سے بیت المقدس میں امن و سلامتی سے یکجا رہتے تھے، اُن کے درمیان منافرتوں کی دیواریں حائل ہوتی چلی گئیں ہیں۔ یہ ناول اس بدقسمت اور مظلوم فلسطینی قوم کی جیتی جاگتی کہانی ہے جو دو تہائی صدی سے وطن کی تلاش میں ہے۔ اس ناول میں تاریخ کے مدوجزر نہایت دلچسپ انداز میں بیان کیے گئے ہیں اور ظلم کے خلاف مسلم خواتین میں جس انداز کے جذبات پرورش پا رہے ہیں، ان کے زیر و بم کا اظہار بڑی عمدگی سے ہوا ہے۔ ایک فلسطینی دانشور جو شیلے جوانوں کو نصیحت کرتے ہیں کہ اسلحے کی زبان استعمال کرنے کے بجائے دلیل اور صداقت کی زبان استعمال کی جائے اور عرب کاز کے لیے قلم کو ذریعہ اظہار بنایا جائے تاکہ دنیا پر واضح کیا جا سکے کے فلسطین میں ناانصافی اور درندگی کے خاتمے کے بغیر دنیا میں امن قائم نہیں ہو سکے گا۔ لہو رنگ فلسطین پڑھتے وقت شدت سے احساس ہوتا ہے کہ ہم ستم زدہ کشمیری قوم کی داستانِ حیات پڑھ رہے ہیں۔ محترمہ سلمیٰ اعوان کی یہ کاوش قابل ستائش ہے۔

☆☆☆☆☆

الطاف حسن قریشی

محترمہ سلمیٰ اعوان، جناب مجیب الرحمٰن شامی، جناب عامر بن علی اور جناب امجد اسلام امجد۔

عالمی ادب کی فروزاں قندیلیں ''ہمیں ایک ایسی ناراض نسل چاہیے''

کولمبیا میں مقام بوگیٹو ایئر پورٹ۔ شلوار، قمیض میں مجھے دیکھا اور ایک شاعر جسے میں جانتی نہیں تھی، مگر اس نے مڑ کر بغیر تعارف کے، مجھے کہا ''السلام علیکم'' میں نے حیرت اور خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ سلام کا جواب دیا اور کہا میں کشور ناہید، پاکستان سے، اس نے انگریزی میں جواب دیتے خوشی سے ہاتھ ملایا، عراق سے۔ سعدی یوسف۔ یہ وہ شاعر تھا جو اپنے ملک سے جلاوطن تھا۔ اس کا انقلابی نظریہ صدام حسین کو قطعی پسند نہ تھا۔ اس سے پہلے کہ صدام اس کو مروا دیتا، کہ عراق میں یونہی ہو رہا تھا، وہ عراق چھوڑ گیا۔ سعدی یوسف اور بہت سے انقلابی شاعروں کے حالات زندگی اور ان کی تخلیقات کے تراجم، سلمیٰ اعوان نے کتابی شکل میں مرتب کیے ہیں، عنوان ہے ''عالمی ادب کی فروزاں قندیلیں'' کتاب کی فہرست دیکھی تو اس میں مجھے کچھ ناموں پر اچنبھا ہوا۔ اب بھلا انقلابی شاعروں اور ناول نگاروں کے درمیان، ہمارا پیارا رومانوی شاعر، کیٹس کہاں سے آ گیا۔ دراصل سلمیٰ اعوان کا مسئلہ یہ ہے کہ ایک تو دیوانگی کے عالم میں ملکوں ملکوں کی سیر، کپڑے خریدنے کے لیے نہیں بلکہ نوادرات کو دیکھنے، وہاں کے ادیبوں کے انگریزی میں تراجم خریدنے اور پھر ان پر سیاسی اور ادبی منظر نامے سمیت، مضامین لکھنے، شاعر اور ناول نگاروں کے رشحات کے حوالے دے کر، آپ کی علمی پیاس کو بجھانا چاہتی ہے، اس کتاب میں میری پسند کے بہت سے لوگ ہیں۔ چونکہ میں نے ابتدا، سعدی یوسف کے نام سے کی ہے۔ اس لیے آیئے اس کی نظموں کے تراجم پڑھیں۔

وہ ملک جو ہمارا تھا، وہ ختم ہو گیا۔ وہ ملک جسے ہم پسند نہیں کرتے، اس کا دعویٰ ہے کہ خون ابھی تک ہماری رگوں میں باقی ہے یہ عراق اب قبرستان کے کناروں پر ہی پہنچے

کشور ناہید

گا- یہ اپنے بیٹوں کی قبروں سے ملک بھر دے گا-

سعدی یوسف صرف شاعر نہیں، نثر نگار، صحافی، پبلشر اور سیاسی کارکن کے طور پر کام کرتا رہا- عرب کے مشہور شہروں میں روایت ہے کہ ادب بیروت میں شائع ہوتا، بغداد میں پڑھا جاتا اور قاہرہ میں لکھا جاتا ہے- وہ کہتا ہے، مجھے اپنا گاؤں چاہیے تمھارا نیویارک نہیں، تم مسلح سپاہی نینوا سے کیوں آئے، تم اتنی دور بصرہ میں کیا کرنے آئے ہو، اپنے اسمگل شدہ سگریٹ لے لو، ہمارے آلو ہمیں واپس کر دو-

اگلا باب: مونا عمیدی کے بارے میں ہے- شام کی حساس اور نئی سوچ کی حامل شاعرہ، جو امریکی ماں کی بیٹی تھی مگر اس نے دمشق نہیں چھوڑا اپنے ملک کو کھنڈر بنتے ہوئے، نظمیں لکھیں "آہ! بغداد کے سنور بند ہیں، تریپولی کی گلیاں ویران ہیں- غزہ پر بمباری ہے، فلوجہ شعلوں میں نہا رہا ہے- دنیا سو رہی ہے اور عرب دنیا بحث میں الجھی ہوئی ہے کہ ورلڈ کپ میچوں میں کون جیتا ہے-"

"رہے نام اللہ کا"

سلمیٰ اعوان نے مونا عمیدی سے ملاقات بھی کی، لکھتی ہیں "مجھے گھر کے دروازے پر خوش آمدید کہا- یہ جان کر کہ میں پاکستان سے ہوں ساری تھکن غائب، باتیں شروع ہوئیں، کولڈ ڈرنک، قہوہ اور کھجوریں، مگر مجھے تو کتابوں کی طلب تھی- مونا کی باتوں سے مجھے لگا پاکستانی دیہی اور شہری عورت کا جائزہ لے رہی ہیں- شام کی سیاست میں اگر حافظ الاسد نے سیکولر ہونے کے باوجود، اسلام کو نئے معنی پہناتے ہوئے اسے نئی تعریف دی - سعدی یوسف کی طرح مونا عمیدی کو بھی نزار قبانی پسند تھا اس کے گھر میں نزار قبانی کی نظم کا ریکارڈ بج رہا تھا-"

مونا نے شام کی لوک کہانیاں سلسلہ وار لکھیں- سیاست پر بھی سنجیدگی سے بات کرتی رہیں، شام کے مستقبل کے بارے میں، باتیں کرتے ہوئے، اس کا گلا بھر جاتا تھا- اس نے بتایا کہ سی آئی اے نے کیسے لوگوں کی تربیت دی، مگر آمرانہ اقتدار کی چکا چوند، یہ سب نہیں سمجھ سکی- صبح کے منظر دھندلا دینے والے ہیں، دمشق کے لوگوں کو کس جرم کی پاداش میں سزا دی گئی ہے- میں کیسے بتاؤں کہ دمشق کی رمضان کی مقدس ساعتیں، مگر رنگین لائٹوں اور قمقموں کے بغیر دمشق میرے خوبصورت شہر - زندگی تو یہاں غروب ہوتے سورج جیسی ہوگئی ہے- چونکہ دونوں شاعروں نے نزار قبانی کا ذکر کیا ہے- اس لیے آیئے، سلمیٰ اعوان کے اس کی شاعری کے ترجمے پر بھی نظر ڈال لیں- "اک ایسی دنیا جہاں مطلق العنانی ہے- جہاں دانشوروں کو تختہ دار پر لٹکایا جاتا ہے، جہاں لکھنے والے بے دین اور مرتد سمجھے جاتے ہیں- مجھے اجازت دیں کہ میں اپنے

بچوں کو یہ سمجھاؤں کہ خدا نے انسانی روح اور جسم کو قتل کرنے سے منع کیا ہے۔"

سلمیٰ نے لکھا کہ دو دن ہی میں اسے پتہ چل گیا کہ نزار قبانی ہر ٹیکسی، ہر گھر، ہر دکان، ہر لب پر مچل رہا ہے۔ نزار قبانی کا باپ شامی اور ماں ترکی - اس کا باپ فرانسیسی تسلط کے خلاف لڑنے والوں کی مدد بھی کرتا تھا۔ تبھی تو بیٹے نے لکھا "ہمارے دشمن ہماری سرحدوں میں رینگ کر نہیں آئے وہ تو چیونٹیوں کی طرح، ہماری کمزوریوں کے ذریعے آئے ہیں۔ اگر اتفاق اور اتحاد کو ہم دفن نہ کر چکے ہوتے اگر اتحاد باقی ہوتا اتحاد کو ہم دفن نہ کر چکے ہوتے اگر اتحاد باقی ہوتا تو دشمن ہمارے خون سے ہولی نہ کھیلتا اور نزار قبانی کی زندگی کی آخری نظم اس کا بھی ترجمہ سلمیٰ اعوان نے کیا ہے "اگر اسرائیلی بلڈوزروں کے نیچے آ کر مرنے سے انکار کریں۔ اپنے لوگوں پر ہونے والی زیادتیوں کے خلاف آواز اُٹھائیں۔ وہ ہماری دھرتی ملیامیٹ کر رہے ہیں۔ ہماری تاریخ مٹا رہے ہیں۔ میں دہشت گردی کا حامی ہوں۔ اگر یہ مجھے۔ روس، رومانیہ، ہنگری اور پولینڈ سے آئے مہاجروں سے بچا سکے۔ یہ مہاجر فلسطین میں آن بسے ہیں اور ہمارے کندھوں پر سوار ہیں۔"

میں نے تین شاعروں کا جو مجھے پسند ہیں، ان کا تعارف آپ سے کرایا ہے۔ میں محمود درویش کو بھول گئی۔ کتاب لیں، آپ کی ملاقات 22 ایسے لکھنے والوں سے ہوگی جو دنیا بھر میں امر ہوئے۔ خوش رہو سلمیٰ۔

☆☆☆☆☆

محترمہ سلمیٰ اعوان، جناب ڈاکٹر خالد سہیل اور دیگر خواتین۔

عراق اشک بار ہیں ہم

میرے پاس بہت کتابیں آتی ہیں۔ میں کتابیں اور پگڑیاں بہت کم خریدتا ہوں۔ اتنے تحفے ملتے ہیں کہ سنبھالے نہیں جاتے۔ مگر اب کوئی عمل غیر سیاسی نہیں رہا اور میری کوشش ہوتی ہے کہ میں سیاسی معاملے کو بھی غیر سیاسی مشغلے میں تبدیل کردوں۔ اتوار کا دن میرے لیے غنیمت دن ہے۔ میں غنیمت کو نعمت سمجھ لیتا ہوں کہ اب نعمتیں ہم سے روٹھ گئی ہیں۔

سلمیٰ اعوان ہماری ایک بڑی بہن کی طرح شفقت کرنے والی خاتون ہے۔ اتنی مخلص ادیبہ کم کم ہمارے ہاں ہوگی۔ کوئی 22 کتابیں اس نے لکھی ہیں۔ تقریباً ساری مجھے دی ہیں جن میں چھ سات سفرنامے ہیں۔ میں مستنصر حسین تارڑ کو بہت پسند کرتا ہوں اور پھر سلمیٰ اعوان نے مجھے متاثر کیا ہے۔ اس کا نیا سفرنامہ ''عراق اشک بار ہیں ہم۔''

لوگ تو سمجھتے ہیں کہ ہنسنے ہنسانے والے سفرنامے اچھے ہوتے ہیں مگر رونے رلانے والے سفرنامے بہت اچھے ہوتے ہیں۔ میں کتاب پڑھتا گیا اور اشک بار ہوتا گیا۔ میرے آنسو آنکھوں میں تیرتے رہے۔ اس لذت گریہ کا جو مزہ آیا ہے وہ بیان نہیں کرسکتا۔ آپ یہ کتاب پڑھیں اور اپنے گلے سے لگ کر روئیں۔ پڑھو اور بار بار پڑھو اور روتے جاؤ مگر آنسو نہ گرنے پائیں۔

''دھرتی کے پیار میں گرفتار لوگو! میں اپنے دروازے پر آئے وحشیوں سے خائف نہیں۔ میں تو ڈرتی ہوں اندرونی دشمن سے۔ آمریت مطلق العنانی بدعنوانی، کرپشن فرقہ واریت اور سکھا شاہی سے۔''

☆☆☆☆☆

محمد اجمل نیازی

سلمیٰ اعوان کی ''بیچ بچولن کی روشن لکیر'' کا ایک جائزہ

سلمیٰ اعوان کا فلیپ نہ لکھوانے کا دعویٰ پڑھ کر میں نے سوچا کہ اعوان قبیلے میں، میں کس کس کو جانتا ہوں۔ بہت سے نام تاروں کی طرح ذہن کی سطح پر نمودار ہوئے۔ دو چار تو اب بھی یاد ہیں، مثلاً عالمی معیار کے فوٹو گرافر محمد قاسم اور اعلیٰ معیار کے ہدایت کار محمد نثار حسین۔ وقت کی کمی کے باعث اگر بے شمار ناموں کو چھوڑ بھی دیا جائے تو قبیلہ اعوان کا یہ اعزاز کون چھین سکتا ہے کہ اس میں آج کے عظیم دانشور، ادیب، شاعر اور افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی نے پورے قبیلے کی عاقبت سنوار دی ہے۔ میرا خیال تھا کہ اس صدی میں ان اصناف میں شاید ہی کوئی دوسرا اعوان جنم لے سکے مگر ''بیچ بچولن'' پڑھنے کے بعد احساس ہوا کہ اعوان تو واقعی زندہ زرخیز اور ذہین قبیلہ ہے۔

میں نے سرسری کتاب پڑھنے کی کوشش کی، زیر ہوا، لفظ لفظ پڑھا، پڑھ چکا تو دل نے کہا واقعی سلمیٰ اعوان کو کسی بے ساکھی کی ضرورت نہیں۔ ''بیچ بچولن'' میں سلمیٰ کی دس کہانیاں ہیں ایک کو چھوڑ کر بیشتر کہانیوں کا بنیادی موضوع محبت ہے۔ مڈل کلاس اور لوئر کلاس کی لڑکی کی محبت..... جسے تصور کرتے ہوئے سلمیٰ نے دل گداز منظروں سے قاری کو تحیّر کی فضا میں اتار دیا ہے۔ محسوس یہ ہوتا ہے کہ اس نے کہیں آپ بیتی کے دھاگے میں جگ بیتی کے موتی پروئے ہیں اور کہیں تجربے اور مشاہدے کے گاڑھے رنگوں کو اپنی ذات کے موقلم سے کینویس پر اتارا ہے۔

پہلی کہانی ''خبر ہونے تک'' کی ہیروئن جہاں آرا، جو بنگالی لڑکی ہے پنجاب میں واقع چیچہ وطنی کی غنائیت سے اس لئے مسحور ہے کہ اس کی محبت چیچہ وطنی کے پردوں میں اوجھل ہے، بے رحمانہ جدائی کے ان اذیت ناک لمحوں کے باوجود وہ صبر اور وفا کی ایسی مثال ہے جسے سلمیٰ کی آنکھ ہی منتخب کر سکتی تھی۔ سلمیٰ کا اصرار یہ ہے کہ عورت جب کسی بات کا ارادہ کر لیتی ہے تو وہ چٹان ہوتی ہے اور جہاں آرا، جیسی گوشت پوست کی نازک اور حسّاس لڑکی جب محبت کرنے پر آتی ہے تو محبت کا عارضی ظہور بھی اس کے لیے زندگی کی نوید بن جاتا ہے۔

وہ پہلی مرتبہ اپنے محبوب سے کہتی ہے ''آؤ شادی کر لیں''

یونس جاوید

وہ محبوب ہنس ہنس کر کہتا ہے۔ "کوئی گڈے گڑیا کا کھیل ہے؟"

"میں سنجیدہ ہوں" وہ کہتی ہے۔

"مگر میں نہیں" پنجاب سے آیا ہوا محبوب مجبوریاں بیان کرتا ہے۔

"چلو دیکھ لیتے ہیں" جہاں آرا نے جیسے چیلنج کیا۔ یہ چیلنج جہاں آرا نے اپنے آپ کو کیا تھا، اپنے محبوب کو یا سارے زمانے کو؟ سب نے کہا یہ جوا ہے، مگر جہاں آرا چٹان بن چکی تھی۔ اس نے چند دن، چند مہینے یا چند سال مانگے تو محمود نے کہا "میں تمھارے فیصلے سے پریشان ہوں" جہاں آرا بولی "میں تم پر کوئی شرط کوئی پابندی نہیں لگاؤں گی جب چاہے چھوڑ کر چلے جانا اور باپ جس سے کہے شادی کر لینا۔" جہاں آرا کا یہ دعویٰ کہ "عشق کی نسوانی تاریخ میں ایسی چند مثالیں شاید مجھ جیسی عورتوں نے ہی رقم کی ہیں۔" بعد میں درست ثابت ہوا اور جہاں آرا نے واقعی ایک مکمل عورت ہونے کا روپ پیش کیا۔ وہ شادی کرتی ہے، ماں بنتی ہے، مگر جب محمود پنجاب لوٹ رہا ہے تو بنگال کی یہ حسینہ اور حساس عورت "آنے والی جدائی کے لمحوں کو آنکھوں میں بھرنے کے بجائے شوہر کا سامان پیک کرتی ہے، پیشانی پر پیار کرتی ہے۔ دونوں آنکھوں کو چومتی ہے اور اس کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں کے پیالے میں تھام کر کہتی ہے مجھے اپنے پاؤں کی زنجیر نہ سمجھنا" وہ بے نم آنکھوں کو چومتی سے اسے رخصت کرتی ہے اور اپنے بچے کو سینے سے چمٹاتی ہے۔ اور سمجھتی ہے کہ بس یہی کافی ہے۔ وہ اپنے آپ کو سمجھنے کا دعویٰ بھی کرتی ہے، یہ کیسی عورت ہے؟ یہ مکمل ہے یا ادھوری؟ خوشدل ہے یا اذیت پسند؟ یہ اس کی عبادت ہے یا قناعت؟ ان سوالوں کے جواب کچھ بھی مگر اتنا ضرور ہے کہ وہ عاشق اور عشق کے اسی تصور نے گیتوں کو جنم دیا ہے۔ برسوں بیت جانے کے باوجود اسے یاد ہے کہ محمود نے اس کے ساتھ سات سو تیس دن گزارے تھے جو صدیوں پر بھاری ہیں وہ چیچہ وطنی کبھی نہ آتی مگر ایک روز اندر کے روگ نے اسے مجبور کر دیا کہ وہاں جائے۔ کچھ مانگنے کے لیے نہیں۔ کچھ دان کرنے کے واسطے۔ وہ کینسر سے مر رہی ہے اور موت سے پہلے اپنا سولہ سالہ جوان بیٹا۔ باپ کے سپرد کرنا چاہتی ہے چیچہ وطنی میں محمود کے باپ سلطان احمد نے دیکھتے ہی پوچھا "بنگال سے آئی ہو؟" اور جواب سے پہلے پوتے کو چھما مار کر رو دیا اور پکارا اوئے محمود اوئے محمود...... مگر محمود...... دس سال پہلے رخصت ہو چکا تھا۔ ہر چند میں نہیں مانتا کہ ایسا ہوا ہوگا۔ یہ مرد حاوی معاشرہ ہے اس میں عورت کے ایثار اور صبر پر تو یقین آ جاتا ہے مگر کسی کے مر جانے پر نہیں۔ اس کے باوجود یہ منظر دلوں کو اس قدر گداز کر دیتا ہے کہ سلمٰی کی بات پر یقین ہونے لگتا ہے۔ محمود کی مجبوری افسانہ نگار کی اختراع ہے یا قاری کو تکنیک سے مارنے کی کوشش۔ اصل تو جہاں آرا ہے، جس نے محبت کے بدلے، دکھ، انتظار، جدائی اور ان سب کے باعث روگ کو...... دانستہ اپنی جھولی میں سمیٹ کر اذیت ناک موت کو گلے لگایا اور امر ہو گئی۔ سلمٰی اعوان نے محبت کی یہ کہانیاں سیدھی سادی تکنیک میں اپنے کرداروں ہی کی زبانی سنائی ہیں۔ جیسے روپ کی جمیلہ، جال کی سلیمہ عزیز اور خجر

جناب انتظار حسین اور افتخار عارف کے ساتھ۔

ہونے تک کی جہاں آرا مگر ہر کردار اپنی کسی نہ کسی پرانی دوست کے حوالے سے ہمیں کہانی سناتا ہے کہ سلمیٰ کے اپنے حلقہ دوستاں کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دوستی اور محبت کے مفہوم کو اس تراش خراش سے واضح کرتی ہے کہ پڑھنے والا کہی ہوئی بات میں نیا پن محسوس کرتا ہے۔ 'روپ' کے خلیل احمد کو دیکھیے، کم ظرف، چھچھورا، اذیت پسند، اجڈ اور بے رحم مرد...... پہلی ملاقات پر ہی جمیلہ کو غصیلی کہہ دینے والا، لالچی اور تلون مزاج، جس میں محبت کی دلآویزی تھی نہ بے مروتی برداشت کرنے کی تاب۔ رخصتی کے تین گھنٹے بعد ہی اس کی فلائٹ جانے والی ہے۔ اس عجلت میں بھی اسے اپنے حساب کتاب، لین دین، رشتہ داروں کی بے مروتی اور کھنڈر پن، سب یاد ہے مگر جمیلہ کے سلگتے جذبات اور ایک ربع صدی تک دیکھے گئے سنہری خوابوں کا علم ہے نہ احساس۔ وہ اس درجہ بے ذائقہ مرد ہے کہ اس سے چھٹکارا حاصل کر لینا ہی نجات ہے، مگر جمیلہ بھی لوئر کلاس کی لڑکی ہے۔ وہ اس اوچھے، بے ڈھنگے، کرخت اور ناتمام ذہنیت کے مالک مرد کو سمجھتی تو ہے مگر دل سے نہیں نکال سکتی۔ اس کا جلدی میں پہلا لمس، پہلی چھاپ، ہونٹوں پر، آنکھوں پر اور پھر اس کا ہر انداز بے چاری جمیلہ کے دل میں کھب کر رہ جاتا ہے وہ اسی پر اکتفا کیے زندگی بھر ساتھ نبھانے کے لیے تیار ہے۔ جدائی کے زخم سہتے ہوئے بھی اسے اسی کا انتظار ہے شاید یہی وہ عورت ہے جس کے سو روپ ہیں۔ جن میں سے یہ روپ بھی سلمیٰ ہی دیکھ سکتی تھی۔

☆☆☆☆☆

محترمہ سیما پیروز، محترمہ ناز بٹ، محترمہ نیلم احمد بشیر، محترمہ حمیدہ شاہین اور محترمہ سلمیٰ اعوان۔

حیرت بھری آنکھ میں چین

اگر میں کہہ دوں کہ مجھے سلمیٰ اعوان کی نثر سے عشق ہے تو یقین جانیے اس میں رتی برابر مبالغہ نہ ہوگا۔ میں برسوں سے انھیں پڑھ رہا ہوں، تب سے جب مجھے ڈھنگ سے قلم تھامنا بھی نہیں آتا تھا۔ جیسی جیتی جاگتی، الہڑ مٹیار کی سی چنچل نثر وہ لکھتی ہیں، کوئی ہے جو ویسی لکھ پائے؟ وہ افسانہ لکھیں یا ناول، کسی موضوع پر مضمون لکھیں یا رپورتاژ اور سفرنامہ، پہلی سطر سے اُنگلی تھامتی ہیں اور آخری سطر تک ساتھ ساتھ لیے چلتی ہیں، کچھ ایسا ہی چین کے اس سفرنامے میں ہو رہا ہے۔

چین جو میں نے دیکھ رکھا ہے:

مگر جس رُخ سے سلمیٰ اعوان نے دکھایا ہے میں نے دیکھا۔ میں ایک بچے کی طرح اُن کی اُنگلی تامے حیرت سے چین کو ایک نئے زاویے سے دیکھ رہا تھا:

اس چین کو جس کے سامنے کے مناظر میں تاریخی اور تہذیبی پس منظر بھی جھانک رہا تھا۔ سلمیٰ اعوان کہیں ستر اور اسّی کی دہائیوں والی اس چینی قوم کو یاد کر رہی ہوتی ہیں جو سائیکلوں پر سوار تھی اور پھر پیڈل مارنے والے زمانے کے لد جانے کے ذکر کے بعد وہ چین دکھاتی ہیں جس میں عوام شاندار ایئر کنڈیشنڈ گاڑیوں، بسوں اور میٹرو میں سفر کرتے ہیں اور مخصوص یونیفارم پہننے والی خوب رُو لڑکیاں برینڈڈ ملبوسات میں ہیں اور ٹکا کے میک اَپ کرتی ہیں۔ جالندھر کے گاؤں سمی پور میں قیام پاکستان سے چار سال قبل پیدا ہونے والی سلمیٰ اعوان ساری عمر ملکوں ملکوں گھومتی رہی ہیں اور دُنیا کو اپنی ننگی آنکھ سے دیکھا ہے۔ وہ طالب علمی کے زمانے میں پنجاب یونیورسٹی اور ڈھاکا یونیورسٹی میں پڑھتی رہیں۔ لہٰذا چین کے اس سفرنامے میں یہاں وہاں کے اور ہر زمانے کے مناظر بہم ہو کر اسے کہیں زیادہ دلچسپ بنا دیتے ہیں۔ یوں یہ سفرنامہ اس لڑکی کی کہانی ہو گیا ہے جس نے ڈھاکا یونیورسٹی کے گرلز ہال میں چین اور روس نواز طالبات کے ماؤ اور لینن سے یگانگت کے نعرے سنے تھے اور ماؤ کی ترجمہ شدہ طوفانی نظموں کو جوشیلی آوازوں میں جنونی لڑکیوں سے گاتے ہوئے سنا تھا۔ یہ کہانی اس عورت کی بھی ہے جس نے سن ساٹھ کے ان چینیوں کو دیکھا تھا جو کراچی کی بلند و بالا عمارتوں کو دیکھ کر کہتے تھے کاش ہمارے پاس بھی کراچی جیسا ایک شہر ہوتا اور اب چین کی عظمت کو اپنی بوڑھی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے اور ہمیں دکھا رہی ہے، ان دو آنسوؤں کے ساتھ جو آنکھوں سے ٹپک کر گالوں پر پھسل رہے ہیں۔ سلمیٰ اعوان چین کی عظمت کے ایک ایک نشان کو دکھاتے ہوئے ہمیں وہ چلن بھی سجھا دیتی ہیں جو کسی زندہ قوم کا ہو سکتا ہے۔

☆☆☆☆☆

محمد حمید شاہد

عراق اشک بار ہیں ہم

سلمیٰ اعوان ایسی لکھنے والی نہیں کہ ان کے بارے میں بتایا جائے کہ انھیں لکھتے ہوئے چالیس برس سے زائد عرصہ ہونے کو ہے اور اس عرصے میں ان کی 22 کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ کچھ جگہ کتابوں کی تعداد 17 بھی بتائی گئی ہے اور یہ اس لیے بتانا پڑتا ہے کہ پڑھنے والوں میں نئے پڑھنے والے بھی ہوتے ہیں۔ ان کی ان کتابوں میں ناول بھی ہیں اور سفرنامے بھی۔ اُن کے بارے میں جو کچھ میں نے پڑھا ہے، اُس کے مطابق اُن کے ناولوں میں شیبہ، ثاقب، زرغونہ، تنہا، گھروندا اِک ریت کا، اور لہو رنگ فلسطین بتائے جاتے ہیں، جب کہ سفرنامہ میں عراق کے موجودہ سفرنامہ سے پہلے: روس کی ایک جھلک، یہ میرا بلتستان، میرا گلگت وہنزہ، سندر چترال، اور مصر میرا خواب وغیرہ شامل ہیں۔ مجھے اس سے پہلے ان کی کوئی کتاب پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ عراق کو آزاد کروانے کے لیے نام نہاد جنگ آزادی کی کامیابی کے بعد عراق کے بارے میں جو خبریں آتی رہتی ہیں، ان میں عراق کے سفر کا حوصلہ کرنا بھی چھوٹے موٹے حوصلے کی بات نہیں۔ لیکن سلمیٰ ایک زیارتی قافلے کے ساتھ گئیں اور جیسا کہ انھوں نے لکھا ہے:

''یہ کربلائے معلیٰ سے بغداد کے لیے واپسی کا سفر تھا۔ گاڑی میں بیٹھنے سے قبل میں نے صبر و رضا کے پیکر، امام عالی مقام، ذی شان کے روضہ مبارک کے چمکتے گنبد کو الوداعی نظروں سے دیکھا'' اور دھیرے سے کہا'' آپ کا شکریہ آپ نے دیدار کروایا مجھے تو کبھی اس دید کی آس امید ہی نہیں تھی'' عراق جانے والے بتاتے ہیں عراق میں ڈرائیور آسانیوں کے بجائے ایسی مشکلات پیدا کر دیتے ہیں کہ عراق میں قیام اور دشوار ہو جاتا ہے، لیکن سلمیٰ اس معاملے میں بھی خوش نصیب رہیں۔ اُن کے اس سفرنامے کا انداز تحریر فکشن اور ناول نگار ہونے کے باعث ایسی تحریر بن گیا ہے جس میں ادب کی چاشنی بھی ہے اور پڑھنے والے یقیناً محسوس کریں گے کہ جہاں جہاں سلمیٰ اعوان گئی ہیں، وہاں وہاں وہ بھی گئے ہیں اور اگر کوئی سفرنامہ ایسا کرنے میں کامیاب ہو جائے، تو پھر قاری کو ایک سفرنامے سے اور کیا چاہیے۔

میں اُن کے سفرنامے سے دو بالکل مختصر باتیں اور درج کرنا چاہتا ہوں، تاکہ اُس شعور اور احساسات کا اندازہ کیا جا سکے، جو اس سفرنامے میں کارفرما ہیں۔

اُن کا کہنا ہے کہ انھیں صحرا کی رات دیکھنے کا تجربہ نہیں تھا، لیکن شام کے سفر کے دوران وہ صحرائی شاموں سے خوب لطف اندوز ہوئیں لیکن جب عراق کی صحرائی شام سامنے آئی تو ان پر'' ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم'' والی کیفیت طاری ہو گئی اور جب رات سے واسطہ پڑا تو'' سانس سینے میں اٹکنے لگا اور آنکھیں جیسے پتھرا سی گئیں'' دوسرا نکتہ سیاسی نوعیت کا ہے۔ یہ ایک عراقی کے احساسات ہیں:

صدام کے زمانے میں ہماری زبان بند تھی، مگر امن تھا، سکون تھا۔ اب ہماری زبان کھل گئی ہے لیکن گھر سے نکلتے ہیں تو نہیں جانتے کہ واپسی ہو گی یا نہیں۔'' اس سلمیٰ اعوان کا تبصرہ بھی سن لیں:'' ہائے وے میریا ربا، وہی وطن والا حال''۔ امید ہے اپ کو یہ سفرنامہ مایوس نہیں کرے گا۔

☆☆☆☆☆

انور سن رائے

''عراق اشک بار ہیں ہم''

سفرنامہ کی ابتدا حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت بی بی حوا رضی اللہ عنھما کو جنت سے رخصت کرنا اور انھیں زمین کی جانب بھیجنے سے ہوئی تھی۔ اس کے بعد سفرنامہ کا باقاعدہ آغاز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ مکرمہ سے مدینہ شریف کی جانب ہجرت کر کے کیا تھا۔ سفرنامہ کی انتہا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معراج شریف پہ تشریف لے جانا تھا اور اس کا اختتام نواسہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے کربلا میں کیا۔

اس کے بعد آج تک جتنے بھی سفرنامے لکھے جا چکے ہیں ان میں کوئی نئی بات یا انفرادیت پڑھنے کو نہیں ملتی۔ وہی ایک ہیرو اور اسے سفر کے دوران کسی خوبرو دوشیزہ سے ٹکرانا یا ہیروئن کا کسی وجیہہ مرد سے ٹکراؤ، ہمارے اُردو سفرناموں کی پہچان بن چکے ہیں لیکن ان میں کچھ سفرناموں کو استثنیٰ حاصل ہے کہ وہ واقعی اس قابل ہیں کہ انھیں اُردو سفرناموں کی تاریخ مرتب کرتے ہوئے فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔ بھلا ہو ہمارے نقادوں اور ادیبوں کا، جو اپنے لکھنے کے علاوہ کچھ اور پڑھنے کے قائل نہیں ہیں۔ اس میں بہت بڑا حصہ ہمارے نقادوں کا ہے جو صرف، ایک کھانے، پیٹل جاتے ہیں اور ادیب کو اُردو ادب کا لازوال کردار بنا دیتے ہیں۔ ایسے حالات میں، ہم بہت سے ایسے شاعروں اور ادیبوں کے نام گنوا سکتے ہیں جو ہمارے انہی، سکہ بند، نقادوں کی نظروں سے اوجھل ہونے کی وجہ سے اُردو ادب میں مقبولیت نہ پا سکے۔ ویسے تو ایسے ناموں کی ایک طویل ترین فہرست ہے لیکن ان میں سب سے پہلے جناب شوکت علی شاہ، جناب ابدال بیلا اور محترمہ سلمیٰ اعوان شامل ہیں۔

''عراق اشک بار ہیں ہم''۔ سلمیٰ اعوان کو اُردو ادب لکھتے ہوئے لگ بھگ چالیس برس سے زائد کا عرصہ گزر چلا ہے۔ اس عرصے میں سلمیٰ اعوان نے 22 کتابیں تحریر کی ہیں۔ ایک سے بڑھ کے ایک کتاب ہے لیکن ہمارے 'نقاد' انھیں بھلائے بیٹھے ہیں۔ اس سے پہلے ہم نے سلمیٰ اعوان کا ناول ''تنہا'' پڑھ رکھا ہے اور حیرت ہوتی ہے کہ 'مشرقی پاکستان سے بنگلہ دیش بننے کی داستان'' کے اس ناول کو وہ پزیرائی نہیں ملی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ''تنہا'' کو اُردو ادب کے کسی کورس میں شامل کیا جاتا ہے کہ ہماری آج کی نسل کو ان حالات کا علم ہوتا جو پاکستان کے ٹوٹنے کا سبب بنے۔

نعمان منظور

اس کے بعد سلمیٰ اعوان کا ناول ''لہو رنگ فلسطین'' ہے جس پر ہم اپنی رائے دے چکے ہیں۔ سلمیٰ اعوان کا نیا سفرنامہ ''عراق اشک بار ہیں ہم'' ہمیں بھی رُلا گیا ہے۔ یہ سفرنامہ پڑھنے سے پہلے ہم عراق کو صرف مقاماتِ مقدسہ کی حیثیت سے ہی جانتے تھے لیکن اس سفرنامہ کو پڑھنے کے بعد ہمیں احساس ہوا کہ عراق وہ نہیں ہے جسے ہم جانتے ہیں۔ عراق تو وہ ہے جسے سلمیٰ اعوان نے قلم بند کر دیا ہے۔ عراق میں صرف زائرین کے لیے مقاماتِ مقدسہ ہی نہیں ہیں بلکہ عراقی تاریخ کو جس جاندار طریقے سے سلمیٰ اعوان نے لکھا ہے، یہ پڑھنے کے علاوہ مسلمانوں کے لیے تاریخی دستاویز کا درجہ رکھتی ہے۔ اس سفرنامہ کے باب نمبر 3 کا آغاز ان فقروں سے ہوتا ہے صحرا کی رات دیکھنے کا میرا تجربہ نہیں تھا صحرائی شاموں کی دید سے میں شام میں خوب لطف اندوز ہوئی تھی۔ اس وقت میرے سامنے جو شام تھی اس نے مجھے ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم والی کیفیت میں مبتلا کر دیا تھا اور جب رات سے واسطہ پڑا تو بھی سانس لینے میں اٹکنے لگا اور آنکھیں جیسے پتھرا سی گئیں۔ باب نمبر 3 'بغداد کا پہلا وار ہی بڑا تیکھا اور کڑا تھا۔ دوپہر اپنے جوبن کے اعتبار سے اس درجہ جوان تھی کہ اس پر آنکھ کا ٹکنا محال تھا۔'

'صدام کے زمانے میں ہماری زبان بند تھی مگر امن تھا سکون تھا پر اب ہماری زبان کھل گئی ہے۔ آپ گھر سے نکلتے ہیں تو جانتے نہیں کہ واپسی ہوگی یا نہیں'' ہائے دے میریا ربا ہی وطن والا حال۔''

''کمبخت نے کیسرے کا چارجر پرس سے نکال کر ہوا میں یوں لہرایا جیسے کوئی کو بڑا سا تپ میں نے جان بوجھ کر اس قلوپطرہ کو ڈسنے کے لیے اس میں رکھا ہوا تھا۔''

''تاریخ اچھی ہے یا بری، اسے چھینیوں اور ہتھوڑوں سے ملیامیٹ نہیں کیا جاسکتا۔ ایران عراق جنگ نے دنیا کو تماشا دکھایا۔ ابھرتی ہوئی طاقت کے حامل دو مسلمان ملک تباہ ہوئے۔''

''پروردگار اس مسکین و یتیم ملت اسلامیہ کو کب کوئی دیدہ ور نصیب ہوگا؟ کب ان دروازوں پر علم کی روشنی دستک دے گی اور کب گلیوں میں پھرتے ان مفلوک الحال بچوں میں ویسی علم دوست شخصیتیں پیدا ہوں گی جنھوں نے اس ناکارہ سی قوم کو ایک شاندار ماضی ورثے میں دے کر دوبارہ ان کے ہاں جنم لینے سے منہ پھیر لیا ہے؟''

''یہ کربلا معلیٰ سے بغداد کے لیے واپسی کا سفر تھا۔ گاڑی میں بیٹھنے سے قبل میں نے صبر و رضا کے پیکر امام عالی مقام و ذی شان کے روضہ مبارک کے چمکتے گنبد کو الوداعی نظروں سے دیکھا اور دھیرے سے کہا، آپ کا شکریہ۔ آپ نے بلایا۔ دیدار کروایا۔ مجھے تو کبھی اس کی دید کی آس امید نہ تھی۔''

254 صفحات پر مشتمل اس سفرنامے کے ہر صفحہ پر لاتعداد ایسے فقرے اور واقعات بکھرے پڑے ہیں جنھیں ایک مضمون میں پیش نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے باوجود ہم نے کچھ فقرے اوپر نقل کیے ہیں جن سے سفرنامہ نگاری کی دور رس نگاہیں، تاریخ سے واقفیت اور صرف ایک ملک کی سیر کرنا مقصد نہیں بلکہ عراق اور وہ تصویر پیش کرنا ہے، جسے آج کے مورخ اور نقاد بھی بھلائے بیٹھے ہیں۔

☆☆☆☆☆

عالمی ادب کی فروزاں قندیلیں ''نخریلی کتاب''

کہتے ہیں نا کہ انسانوں کی طرح کتابوں کے مزاج بھی الگ الگ ہوتے ہیں۔ کچھ دوستی سے بھرپور اور کچھ دور ہٹانے والی۔ کچھ کتابیں نصیحت کرتی ہیں تو کچھ اُداس دل پر تسلی کے پھاہے رکھتی ہیں۔ کچھ کتابیں سیدھی سادھی شریف النفس سی جب بھی جس بھی ہنگام کھولو وہ اپنی تحریر میں موجود خزانوں سے آپ کو مالا مال کر دیں۔ اور کچھ کتابیں نخریلی بھی ہوتی ہیں۔ ممتاز لکھاری سلمیٰ اعوان کی یہ کتاب ''عالمی ادب کی فروزاں قندیلیں'' ایک ایسی ہی نخریلی اور سحر آگہیں کتاب ہے نخریلی اس لیے کہ آپ اس کتاب کو اپنے آس پاس بکھرے ہوئے ہنگام کے درمیان کھول کر پڑھیں گے تو یہ ہاتھ نہیں آئے گی۔ اگر آپ اس کتاب کو وٹس ایپ کے میسجز پڑھتے ہوئے یا فیس بک پر پوسٹوں کو لائک اور چیک کرنے کے درمیان پڑھیں گے تو یہ کتاب آپ سے ناراض ہو جائے گی۔ یہ کتاب ایک خاصے کی چیز ہے سو اس کو پڑھنے کے لیے اگر وقت نکالیں اور اس کا نخرہ برداشت کریں تو پھر یہ آپ کو ایک ایسے جہانِ حیرت میں لے جائے گی جہاں آپ کی ملاقات شام کی گلیوں میں نزار قبانی سے ہو گی، کبھی آپ خود کو دوستووسکی کے گھر میں موجود پائیں گے جہاں سماوار پر چائے دم پر رکھی ہے اور دوستووسکی رائٹنگ ٹیبل پر جھکا ادب کے شاہکار تخلیق کرنے میں مصروف ہے۔ کبھی کیٹس سے باتیں ہوں گی تو کبھی اپنی دھرتی کے دکھ میں شعر کہنے والا محمود درویش آپ سے ملاقات کرے گا۔ یہ کارنامہ محترمہ سلمیٰ اعوان نے سرانجام دیا اور اس ایک کتاب میں دنیائے ادب کے چنیدہ نابغۂ روزگار تخلیق کاروں کو جمع کر دیا۔ اس کتاب کا انتساب ہے ''اُن اجنبی سرزمینوں کے نام جنھوں نے مجھے خوش آمدید کہا اور اپنے لعل و گہر سے میرا تعارف کروایا'' اس انتساب سے یہ اندازہ تو ہوتا ہے کہ محترمہ سلمیٰ اعوان نے دنیا کے مختلف خطوں اور مختلف زبانوں سے لکھنے والے ان عظیم تخلیق کاروں کو ان کی دھرتی، ان کی سرزمین پر جا کر سمجھنے، کھوجنے اور دریافت کرنے کی کوشش کی، جس سرزمین کو ہواؤں نے اس تخلیق کار کے وجود کی مہک کو محسوس کیا۔ جن سیاسی اور سماجی بدلتے ہوئے موسموں نے اس تخلیق کار کے شعر اور سوچ کی آبیاری کی سلمیٰ اعوان بنفسِ نفیس وہاں جا کر اس فضا میں تخلیق کار کے تخلیقی وجود کی مہک کو محسوس کرتی ہیں اور اس کو انتہائی خوب صورت انداز میں پڑھنے والوں تک پہنچاتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اُردو ادب میں یہ اپنی نوعیت کی واحد انوکھی کتاب ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے اُردو ادب کو سلمیٰ اعوان بھی ایک ہی نصیب ہوئیں۔ دور دراز ملکوں کے سفر پر جانا۔ وہاں کی سیاسی، سماجی اور ثقافتی زندگی کو سمجھنا اور پھر وہاں

سعدیہ قریشی

کی سماجی تبدیلیوں کو تاریخ کے تناظر میں جاننا اور اسے بیان کرنا اس کی تحریر کا بنیادی وصف ہے۔ ان کا یہ سفر "تنہا" سے شروع ہوتا ہے جس میں سابقہ مشرقی پاکستان کے سانحے کا تذکرہ ناول کے پیرائے میں ہے۔ اور یاد رہے کہ یہ بھی کوئی ٹیبل سٹوری نہیں بلکہ ان دنوں وہ ڈھاکہ یونیورسٹی میں طالبہ کی حیثیت سے وہیں موجود تھیں۔ پھر وہ 'لہو رنگ فلسطین'، 'مصر میرا خواب'، 'روس کی ایک جھلک'، 'عراق اشک بار ہیں ہم' جیسے خوبصورت سفرنامے قاری کے سامنے لے کر آتی ہیں۔ انہی سرزمینوں کے سفر کے دوران انھوں نے وہاں کے عظیم تخلیق کاروں کو ایک نئے سرے سے دریافت کیا اس دل پزیر تجربے کو عالمی ادب کی فروزاں قندیلیں لکھ کر ایک شاہکار تخلیق کیا۔ چلیے ہم بھی سلمیٰ اعوان کے ساتھ سب سے پہلے دمشق کی گلیوں میں نزار قبانی سے ملتے ہیں۔ دنیائے عرب کی ایک باغی آواز۔ سفر کے پیرائے میں انقلابی اور رومانی جذبات کا آہنگ ہم آہنگ ہوئی۔ سلمیٰ اس شاعر کو کھوجنے نکلتی ہیں تو کیسے دمشق یونیورسٹی کے پروفیسرز کا پتہ حاصل کرتی ہیں کہ اس نے نزار قبانی پر پی ایچ ڈی کی ہوئی ہے۔ کبھی وہ دمشق کے فٹ پاتھوں سے نزار قبانی کی عربی شاعری کا انگریزی ترجمہ ڈھونڈتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ عالمی طاقتوں کے جبر کو للکارنے والا شاعر۔ فرسودہ روایات کے خلاف علم بلند کرتا ہوا نزار قبانی کہتا ہے:

ہمیں ایک ایسی ناراض نسل چاہیے
جو تاریخ کی بنیادوں کو ہلا دے
غلطیوں کو برداشت نہ کرے

.....

پھر وہ ہماری ملاقات مونا عمیدی سے کرواتی ہیں۔ شام کی ایک حساس اور ہر دلعزیز شاعرہ جو اپنے وطن پر ٹوٹنے والے ظلم کو اپنے قلم سے بیان کرتی ہے۔ مونا عمیدی سے ملتے وہ ان کے گھر چلی جاتی ہیں عربی قہوے اور کھجوروں کے ذائقے کے درمیان شام کے سیاسی اور سماجی حالات کی افسوس ناک صورت حال پر گفتگو ہوتی ہے۔ اپنی عربی نظموں کو انگریزی میں ترجمہ کر کے شام کی ایک شاعرہ پاکستان سے آئی ہوئی تخلیق کار کو سنا رہی ہے۔

صبح کے منظر رلا دینے والے ہیں
دمشق کے لوگوں کو کس جرم کی پاداش میں سزا دی گئی ہے
دمشق میرے خوبصورت شہر
زندگی تو یہاں غروب ہوتے سورج جیسی ہو گئی ہے

.....

سلمیٰ اعوان ہمیں روس کے قومی شاعر الیگزینڈر پشکن سے ملوانے کے لیے اس تاریخی اپارٹمنٹ تک لے جاتی ہیں جہاں اس بے بدل شاعر نے اپنی زندگی کا آخری ایک سال گزارا۔ ایک طرف کتابوں کا ڈھیر ہے۔ ایش ٹرے دھری ہے۔ کرسی کا رُخ یوں ٹیڑھا ہے جیسے ابھی ابھی پشکن لکھتے ہوئے ذرا سا باہر کو گیا ہو۔ قاری بھی اس ماحول کو محسوس کرنے لگتا ہے۔ اور خود کو اسی کا حصہ سمجھتا ہے۔ ماسکو جا کر کوئی دوستووسکی کو کیسے بھول سکتا ہے۔ سلمیٰ اعوان ہمیں اس شہرہ آفاق ناول نگار کے تاریخی گھر میں لے کر جاتی ہیں جو اب میوزیم بنا دیا گیا ہے یہ وہ گھر ہے جہاں یہ عظیم تخلیق کار کچھ عرصہ کرایہ دار کی حیثیت سے رہا۔ دیواروں پر

جناب شاہد رضا، محترمہ نازبٹ، محترمہ فرحت پروین، محترمہ فردوس، جناب امجد اسلام امجد، محترمہ سلمیٰ اعوان اور دیگر احباب۔

دوستوئیکی کی پسندیدہ پینٹنگز آویزاں ہیں۔ اس کے زیر استعمال چھتریاں، ہیٹ اور صندوق رکھے ہیں۔ اپنی بیوی دوستوئیکی کے نام خطوط بھی یہاں محفوظ ہیں۔ ڈرائنگ روم میں اس کے زیر استعمال پیتل کا سماوار اور چائے دانیاں۔ اینا دوستوئیکی اپنی یادداشتوں میں دوستوئیکی کی چائے کے ساتھ خصوصی لگاؤ کا تذکرہ اس طرح کرتی ہے۔ ''اچھی چائے اس کی کمزوری تھی۔ چائے بنانے کا خصوصی اہتمام ہوتا۔ سب سے پہلے وہ اُبلتے ہوئے پانی سے کیتلی کو کھنگالتا اس کا چمچ مخصوص تھا جسے بچے پاپا کا چمچ کہتے۔'' یوں قاری تک دوستوئیکی کی گھریلو زندگی کی ایک جھلک بھی پہنچتی ہے۔ ٹیگور سے ملاقات کروانے کے لیے سلمیٰ اعوان ہمیں 1969 کی ڈھاکہ یونیورسٹی میں لے جاتی ہیں جہاں رم جھم بارش کی نرم پھوار پڑ رہی ہے۔ اور پوکھر کنارے سہیلیوں کے جھرمٹ میں مغربی پاکستان سے آئی ہوئی ایک سانولی سلونی لڑکی سلمیٰ ٹیگور کے سریلے گیتوں کی اسیر ہو جاتی ہے۔ وہ روم کی یاترا پر جاتی ہیں تو ہمیں گھنگریالے بالوں، ستواں ناک والے رومانی شاعری کیٹس سے ملواتی ہیں۔ A thing of beauty is joy forever ''اے تھنگ آف بیوٹی از جوئے فار ایور والا'' لازوال فقرہ کہنے والا جواں مرگ شاعر کیٹس۔ اور اس کی شاعری مصنفہ کے لیے ایک ایسی محبت ہے جس کی وہ زمانوں سے اسیر ہیں اس لیے وہ اس میوزیم کو دیکھنے پہنچ جاتی ہیں جہاں اس بے مثل شاعر سے وابستہ چیزیں، فینی کو لکھے ہوئے خطوط یادوں کی صورت بکھرے پڑے ہیں۔ اس کمرے میں 23 فروری 1821 کو جان کیٹس کی وفات ہوئی۔ اس کتاب میں جابجا مصنفہ کے ایسے مشاہدے اور تجربے بکھرے پڑے ہیں جو مختلف زبانوں اور خطوں سے تعلق رکھنے والے عہد ساز تخلیق کاروں کے حوالے سے سلمیٰ اعوان کو پیش آئے۔ احساس کی گندھی ہوئی خوبصورت نثر کے ذریعے وہ اپنے قاری کو بھی ان تجربات میں شریک کر لیتی ہیں۔ ''عالمی ادب کی فروزاں قندیلیں'' کی صورت میں سلمیٰ اعوان کا یہ کارنامہ بلاشبہ سراہنے اور توجہ حاصل کرنے کے قابل ہے۔ مجھے فخر ہے کہ اُردو ادب کو سلمیٰ اعوان جیسی لکھاری ملی جو دوسرے خطوں پر جنم لینے والے عظیم ادب کا تخلیقی شعور رکھتی ہیں۔ ان کے فن پاروں کو ان کے سماجی اور سیاسی تناظر میں سمجھنے کے لیے دور دیسوں کے سفر کو نکلتی ہیں تو اس نوع کی کتاب جیسی خاصے کی چیز وجود میں آتی ہے۔

☆☆☆☆☆

روس کی ایک جھلک

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ علم کے حصول کے لیے سیاحت سے بڑھ کر دلچسپ اور مؤثر ذریعہ اور کوئی نہیں آپ اپنی ساری زندگی کتب خانوں اور تعلیمی اداروں کی چار دیواریوں میں گزار دیں پھر بھی آپ کے علم و دانش میں وہ تاثیر پیدا ہوتی جو سیاحت انسان کو عطا کرتی ہے۔ انسانی تاریخ کی اولین کہانیوں نے بھی انسان کے سیاحتی تجربات سے ہی جنم لیا اور آج تک کہانی کہنے اور سننے کا عمل انسانی زندگی کے ایک رومانس کے طور پر زندہ ہے۔

زیر نظر کتاب ''روس کی ایک جھلک'' مصنفہ سلمٰی اعوان کے روس میں گزرے دنوں کا احوال ہے۔ دنیا کے مختلف ملکوں کے بارے میں معلومات اور اعداد و شمار پر مشتمل انتہائی معیاری کتابیں دستیاب ہیں جو مقابلے کے امتحان اور ذہنی آزمائش کے مقابلوں میں حصہ لینے کے لیے یقیناً کارآمد ہو سکتی ہیں لیکن اس کتاب کا تعلق تصانیف کے اس قبیل سے ہے، جن میں تحریر کے الفاظ محظ کسی چیز کا رنگ بتاتے ہی نہیں دکھاتے بھی ہیں۔ ان الفاظ میں چائے کا صرف ذکر نہیں ہوتا بلکہ اس کی خوشبو اور پیالوں کی کھنک کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ دراصل فن کی تعریف ہی میرے نزدیک یہ ہے کہ وہ انسان کی کسی ایک حس کے ذریعے منکشف ہوتا ہے اور تمام انسانی حیاتی نظام کو اس تجربے میں شامل کر لیتا ہے۔

روس اپنے رقبہ کی وسعت، تاریخ کے اتار چڑھاؤ اور ثقافتی رنگا رنگی کے حوالے سے دنیا کا بے مثال ملک ہے۔ لیکن اس عظیم ملک کے حوالے سے لوگوں کی معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ سوویت یونین کے دور میں سستے روسی لٹریچر کی فراوانی تھی جو اب ناپید ہے۔ سلمٰی اعوان نے اپنے اس فرنامے میں روس کا ایسا مکمل تعارف پیش کیا ہے کہ پڑھنے والا اس کے سحر میں گرفتار ہو جاتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مصنفہ روسی ادب معاشرت اور تہذیب و ثقافت سے مکمل واقفیت رکھتی ہیں۔ یہ سفرنامہ پڑھ کر مجھے Darvla Murphy کا سفرنامہ "Where the Indus is Young" یاد آیا جس میں اس نے گلگت بلتستان میں موسم سرما گزارنے کے اپنے تجربے کو بیان کیا تھا۔ ایسا ممکن ہی نہیں کہ ''روس کی ایک جھلک'' کو پڑھنے کے بعد روس جانے کی شدید خواہش جنم نہ لے۔

☆☆☆☆☆

غلام محی الدین

''لہو رنگ فلسطین'' ..... سلمیٰ اعوان کے ناول کا سحر

خامہ انگشت بدنداں ہے، اسے کیا لکھیے

.....

بات یہ ہے کہ سلمیٰ اعوان نے ایک عرصہ سے ایسی ستم رسیدہ اور اقوام عالم کی نفرت گزیدہ قوم کی رودادِ الم بیان کا تہیہ کیا ہوا ہے جو عالمی سپر پاورز کا ہدف ملامت بنی ہوئی ہے۔ جس کی ہر بات اس کی تہذیب، اس کی فکر و دانش حد یہ کہ اُس کے دین اور پیغمبر تک کی نفی ہو رہی ہے۔ یہ صرف ساجدہ سلاجیک کے وطن سربیا اور سراجیوو وہی تک محدود نہیں بلکہ نفرتوں، ملامتوں کے اہداف کا محیط پھیلتا اور بڑھتا جا رہا ہے۔ حد یہ ہے کہ اب تو نوبت میانمار کے خاموش اور بے ضرر لوگوں کے گھروں کے در و دیوار اس آگ کے شعلوں میں لپیٹ میں آ چکے بلکہ جل سر بھسم ہو رہے ہیں۔ اس آگ کے شعلوں کی حدت و تمازت کو صرف اور صرف ایک ہی قلم نے محسوس کیا ہے اور وہ ہے سلمیٰ اعوان کا قلم۔ سلمیٰ اعوان ایک ایسا قلمی جہاد کر رہی ہے جس کا جواب نہیں، یہی تو جہاد ہوتا ہے۔ اور میں سوچتی ہوں کہ یہ خاتون اس قوم کے تنِ داغ داغ پر پنبہ کہاں کہاں رکھے گی اور اب اس نے ایک اور ساز پُر درد پر اپنے قلم کی مضراب رکھ دی ہے۔ یہ اسرائیل اور فلسطین کا درد بے کراں اب قصۂ پارینہ بن چکا ہے کہ اس قصہ کی ابتدا سے انتہا ایک صدی تک پہنچنے والی ہے۔ لوگوں کے لیے یہ ماجرائے غم رفت و گزشت ہو چکا ہے۔ بہرحال اب سلمیٰ اعوان نے یہ سازِ پُر درد چھیڑ ہی دیا اور کس منفرد انداز میں۔ کس شائستہ و پرتحمل اسلوب میں، کیسے ٹھنڈے ٹھنڈے انداز میں اس کا لفظ لفظ فلسطین کے پھولوں زیتون اور عراق کے شگوفوں کی مہک میں بسا ہوا ہے۔ نہ گلہ ہے نہ کوئی شکوہ بس احوال واقعی کی نشان دہی کا آغاز ہے ابھی تو۔

☆☆☆☆☆

الطاف فاطمہ

ادبی اور تاریخی شہ پارہ ''تنہا''

مشرقی پاکستان کی علیحدگی پر اظہار غم شاعری کا بکثرت موضوع رہا۔ سولہ دسمبر کے حوالے سے آج بھی نظمیں ہوتی ہیں لیکن نثر بالخصوص ناول اور افسانہ میں اس موضوع کو اس گداز اور تعلق خاص سے کم ہی برتا گیا۔ بنگال سے اُلفت خوابیدہ میری ہمیشہ سے کسک رہی ہے۔ بنگال کے متعلق میری علمیت دریائے گنگا، بہم پتر، میگھنا، ڈیلٹا، کرنا فلی، سندر بن، سہلٹ، چٹا گانگ، نرائن گنج بندرگاہ، ڈھاکہ، کاکس بازار، بنگال کا جادو، زُلف بنگال، ماجھی، ناؤ شبنم، روبن گھوش تک محدود تھی اور 1970 کے قبل کے رسائل میں مغربی پاکستان سے کسی کا مشرقی پاکستان تبادلہ ہو جانا بہت دور کے اپنوں میں چلا جانا لگتا تھا۔ تاریخی سطح پر اس سلمٰی اعوان کے ناول ''تنہا'' کی دو خصوصیات یا تجزیاتی پہلو ہیں۔ اول یہ کہ بنگال کے مناظر، ثقافت،، روزمرہ زندگی، رسوم اور کھانے اور دوم سیاسی و سماجی اختلاف رائے۔

وہ نام جو مخصوص علاقے کی خوشبو رکھتے ہیں جیسے نور العباد، نذرل ، اروما، نورالنار، شمس النار، زہرت، مستورہ، لطف النساء اور شلپی ..... وہ ذخیرہ الفاظ (Vocabulary) جن کی صوتی تاثر میں جغرافیہ آنکھ مچولی کھیلتا ہے جیسے باشائیں، پوکھر، جل پدو، نوکا، مالوتی، کچری پانا وغیرہ اور وہ خصوصی بنگالی کھانے موری گھنٹو، ڈاب، مسور کی دال کا پانی، سندیش، پیازو، کیٹلین پر اُبلے چنے اور لال بیر جن کا ہمارے معاشرے میں رواج نہیں۔ بنگالی ثقافت اور رسوم بھی دلچسپ اور عجیب ہیں۔ بردکھوا کے موقع پر میک اپ سے سجی سجائی روپہلی ساڑھی میں ملبوس لڑکی کو کمرے میں لایا جاتا ہے اور لڑکے والوں کی طرف سے صرف مرد ہوتے ہیں۔ لڑکے کا بڑا بھائی لڑکی سے ناچ گانے کے متعلق پوچھتا ہے۔ وہ ستار بجا کر دکھاتی ہے اور اچھا گانے بجانے کی بنیاد پر پسند کر لی جاتی ہے۔ ان تمام رسوم کا اسلام سے بہت کم اور ہندوازم سے بہت زیادہ قریبی تعلق دکھائی دیتا ہے۔ البتہ عید کے تہوار میں ہمارے ساتھ مماثلت ہے پاجامے اور کرتے مرد پہنتے ہیں، سویاں پکائی جاتی ہیں۔ اکتارہ بجاتے فقیر ہیں۔ شادی بیاہ میں کم عمر بچیوں کا گانا، پیلی ساڑھی میں دلہن کی چوکی پر بیٹھ کر اُبٹن لگوانا، سالیوں کا دولہا کو روکنا یعنی گیٹ چھٹائی اور ڈھلیکہ کی رسم دلچسپ ہیں۔

سلمٰی اعوان نے ناول میں قدرتی مناظر کی تصویر کشی شاندار کی ہے بلکہ فوٹو کھینچ کر پڑھنے والوں کے سامنے سجا دی ہے۔ ادیبہ کے ساتھ قاری بھی فطرت کی رعنائیوں اور دلفریبیوں کو دیکھ سناٹے میں آ جاتا ہے۔ سندر بن میں دیو قامت سبز درختوں کے جھنڈ، لشکارے ماتری ہرنوں کی

دردانہ نوشین خان

ڈاریں، بے کراں پانیوں اور سبزے کے سلسلے، درختوں میں گھرے بانس کے گھر جن کی دیواروں پر رنگ برنگے پھولوں والی بیلیں، پھوکروں میں کھلنے والے کنول جو اپنی خوبصورتی اور سرخی میں گلابوں کو مات کرتے، سورج طلوع ہوتا تو لالی پانی میں گھلتی جاتی۔ تاڑ اور سپاری کے قد آور درخت جھومتے آنکھوں کو تازگی دیتا تا حد نظر سبزہ، بے اختیار وہ کہہ اُٹھتی ہے "اللہ، یہ بنگال کی صبح ہے، اتنی حسین۔ جو میں اسے نہ دیکھتی تو جیون تشنہ ہی رہتا۔" لیکن یہ سارا حسن فطرت کی فیاضی تھی، حسن بصیرت، حسنِ اخلاق، تحمل برداشت جو قوموں کی یکجہتی، ارتقا اور پیش قدمی کے لیے لازم ہے وہ بنگال میں یکسر مفقود تھا۔ یہ سال تھا جب مشرقی بنگال دشمن کے بھڑکائے الاؤ کے کنارے تک پہنچ چکا تھا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ "تنہا" پر بات ہو اور سیاست نہ آئے۔ یہ ہی تو اس ناول کی بنیادی تھیم ہے۔

نذرل چچا سے شلپی تک کا سفر "ہمارا اپنا ایک اسلامی دیش ہوگا جہاں کوئی کسی پر ظلم نہیں کرے گا" کے خواب سے آغاز کرنے والا سفر جلد ہی ست پڑ گیا۔ حیرت کا پہلا سوال اور اشتعال کی پہلی آواز اردو کو سرکاری زبان بنانے کا اعلان کے ساتھ اُبھری۔ جب بنگالی زبان نہیں رہے گی تو تحریک پاکستان کے کارکن دادو کا یہ دکھ آنے والی نسلیں نذر الاسلام کو بھول جائیں گی۔ ٹیگور کو نہیں پڑھ سکیں گی۔ شلپی کو جو شیلے پن پر ابھارتا ہے۔ دادا کا بخار نہ اُتر رہا تھا۔ گھر بار ش میں بہہ گیا تھا۔ قیمتی کتابیں ضائع ہو گئیں۔ چھت پر دم ٹپکتی تھی۔ امداد دفتروں کے چکر سے سیر بھر چاول بھی نہ ملے تو وہ دو کنال کے رقبے میں پھیلی ضلع کے حاکم کی حویلی پر پہنچ گیا۔ ضلع کے حاکم سے اس جوشیلے لڑکے کی ملاقات اہم ترین لمحہ حیات تھا۔ جب سرخ وسفید رنگت والا حسین امیر مرد کہتا ہے:

"دفع ہو جاؤ، نکمے ذلیل لوگ، مانگنے کے سوا تم لوگوں کو اور کچھ آتا ہے۔ ناک میں دم کر رکھا ہے اس سست ذلیل قوم نے" یہ پہلا وحشت ناک چرچا ہوتا ہے کہ یہ حاکم لوگ ہمارے اپنے؟ افسر شاہی کے دور غلامی جیسے متکبرانہ رویہ نے ایک شلپی کو نہیں بدلا۔ ایک اکثریت کو مظلومیت کا یونیفارم دے دیا۔ ناول کا بیک وقت رومانوی اور لرزہ خیز واقعہ اور اس لانچ کا طوفان میں ڈوب جانا تھا جس میں شلپی سمیعہ کو لے کر جا رہا تھا۔ آکسفورڈ کا تعلیم یافتہ، ڈھاکہ ہائی کورٹ کا بیرسٹر، طلبہ کا رہنما لانچ کے فرش پر غربا کے ساتھ سونے والا شلپی جس کی دانستہ بے نیازی سمیعہ کو سلگاتی تھی۔ طوفان کی زد میں آنے والی لانچ جب کھلونے کی طرح ہوا میں اُچھلتی تو وہ اسے اپنی کمر پر رسّے سے باندھ کر دریا میں کود گیا اور موت کی وادی سے اُسے بچا نکالا۔ روزمرہ زندگی، یونیورسٹی ہوسٹل لائف، گپ شپ، ہلہ گلہ میں ذرہ سا لطف اندوزہ ہونے کا موقع ملتا ہے تو ناول نگار کا کوئی چشم کشا، تیر بہدف، نشتر نما جملہ سارا مصنوعی لطف ختم کر کے تلخ حقیقت میں لا پھینکتا ہے۔ "تنہا" ایک دل گداز، با مقصد اور یاد رہ جانے والا ناول ہے۔

☆☆☆☆☆

عالمی ادب کی فروزاں قندیلیں

سلمٰی اعوان ہمارے ادب منظر کا ایک معارف نام ہے، جن کی تالیفی اور تخلیقی زندگی اپنے پچاس سال پورے کر رہی ہے۔ وہ بطور ناول نگار سفر نامہ نگار اور افسانہ نگار تو خوب جانی پہچانی جاتی ہیں۔ پاکستان کے سیاسی و سماجی معاملات انھیں بار بار اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔1965 کی جنگ جب اُن کے تخلیقی شعور میں ہلچل مچاتی ہے تو ''ثاقب'' کی شکل میں اُس کا اظہار ہوتا ہے ۔ وہ تلخ والمناک باب، جس نے پاکستان کو دو ٹکڑے کیا۔ جب یہ ہلچل کرتا ہے تو ''تنہا'' تخلیق ہوتا ہے۔ فلسطین، عراق، شام اُسے اپنی جانب بلاتے ہیں تو ''لہو رنگ ادب کی فروزاں قندیلیں'' ہیں۔ اس کتاب میں سلمٰی اعوان عالمی ادب کے ایک باذوق قاری کے طور پر ہمارے سامنے آتی ہیں ۔ انھوں نے عالمی ادب کے 16 لکھنے والوں پر اپنا قلم اُٹھایا ہے اور یہاں ہمیں اُن کے مطالعہ کی وسعت اور مشاہدے کی گہرائی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ عالمی ادب کے ان لکھنے والوں میں پشکن، لیوٹالسٹائی، دوستووسکی، مولانا جلال الدین رومی، یونس ایمرے، جان کیٹس اور ابو نواس جیسے عظیم عالمی ادب کے کلاسیکل شامل ہیں۔ ان کے پہلو بہ پہلو میں بیسویں صدی میں عالمی ادبی منظر پر اپنے نقش ثبت کرنے والے رابندر ناتھ ٹیگور، بورس پاسترنک، محمود درویش، گوزیو کار دوسی بھی ملتے ہیں۔ نزار قبانی، مونا عمیدی اور سعدی یوسف جیسے انقلابی عرب شعراء بھی اس میں نظر آتے ہیں اور بلاشبہ ان لکھنے والوں کو ایک کتاب میں جمع کر کے سلمٰی اعوان نے اُردو قارئین کے عالمی ادب تک رسائی کا ایک اہم موقع فراہم کیا ہے۔ سلمٰی اعوان فطرتاً ایک سیاح ہیں اس لیے وہ جہاں بھی جاتی ہیں وہاں کے شاعروں، ادیبوں اور تہذیبی شخصیات سے ملنے اور اُن کے بارے میں جاننے کی کوشش کرتی ہیں۔

''عالمی ادب کی فروزاں قندیلیں'' پڑھتے ہوئے جس بات کا احساس سب سے پہلے ہوتا ہے۔ وہ لکھنے والی کا غیر رسمی انداز ہے۔ سلمٰی اعوان نے ان مضامین کو بطور نقاد تحریر کیا ہے۔ وہ تنقیدی اصطلاحات کے استعمال سے بھی گریز کرتی ہیں۔ ان مضامین میں سب سے نمایاں بات یہ ہے کہ سلمٰی اعوان نے عالمی ادب کے ان اہم لکھنے والوں کو جس طرح پڑھا اور محسوس کیا ہے اُسے اپنی رواں دواں نثر میں

نرجس ملک

محترمہ شاہدہ دلاور شاہ، محترمہ فرحت پروین، محترمہ بشریٰ رحمن، جناب کیول دھیر، جناب امجد اسلام امجد، جناب عاقب شہزاد، محترمہ سلمیٰ اور دیگر۔

بیان کر دیا ہے۔ جب ہم اُس کو دوستو وسکی اور اُس کی بیوی کے بارے میں ایک مضمون کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہاں سینٹ پیٹرز برگ کی زندگی ہمارے سامنے ہے۔ اس مضمون میں دوستو وسکی کی کتابوں پر کوئی تنقیدی تعارفی تبصرہ نہیں۔ بس ایک عظیم لکھنے والے کے قرب وجوار میں ہونے والی کیفیت اس تحریر سے پوری طرح نمایاں ہوتی ہے۔ سلمیٰ اعوان کا روسی شعر و ادب سے شغف انھیں روس کے سب سے بڑے شاعر اور بڑے ناول نگار ٹالسٹائی تک لے جاتا ہے وہ روسی لوگوں کے طرز زندگی سے متاثر ہوتی ہیں مگر اُن کی آنکھیں اس معاشرت کے نقائص کو بھی نظرانداز نہیں کرتیں۔ پشکن کی شاعری اور ٹالسٹائی کے ناول میں روسی لوگوں کی روح تک رسائی دیتے ہیں۔ سلمیٰ اعوان بیسویں صدی کے ایک اہم روسی ناول نگار بورس پاسترنک تک بھی آتی ہیں جیسے سوویت یونین میں اشتراکی نظام سے انحراف کے باعث امریکہ میں پناہ لینا پڑی۔ اس عہد میں مغرب اور روس کے تضاد کے باعث بورس پاسترنک کو کافی شہرت ملی مگر اب اُس کا تذکرہ کم کم ہوتا ہے۔ سلمیٰ اعوان اپنے مضامین میں کسی نظریاتی تعصب سے کام نہیں لیتی۔

☆☆☆☆☆

جناب منو بھائی، محترمہ سلمیٰ اعوان، محترمہ نیلم احمد بشیر اور دیگر۔

تصویر کا یہ رُخ بھی

سچی بات تو یہ ہے کہ میں زندگی میں رکھ رکھاؤ اور معیار کا بہت قائل ہوں۔ عشق نہ پچھے ذات یہ مشہور زمانہ کہاوت قطعی بکواس۔ اب بھلا ایسا بھی اندھا عشق کیا کہ انسان مخمل میں ٹاٹ کے پیوند جوڑے اور جوڑ کر بڑا خوش ہو، جیسے وہ سٹوپڈ آصف بشیر تھا۔ متوسط طبقے کی ایک لڑکی کے پیچھے ایسا دیوانہ ہوا کہ شادی کی اور بچّے پیدا کیے۔ کبھی مِلو، حال احوال پُوچھو تو خود کو دُنیا کا خوش قسمت انسان سمجھتا ہے۔

بہر حال ایسی حماقتوں کی میری زندگی میں تو قطعی گنجائش نہیں۔

بڑی گرم دوپہر تھی۔ ڈرائنگ روم میں بڑے صوفے میں دھنسا ہیرالڈ The Herald دیکھ رہا تھا جب وہ پاگل سی میری ممیری بہن اُونچے اُونچے بولتی کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

''یہاں ایک میرا بے حد پیارا میرا بھائی رہتا ہے۔ بڑا نک چڑھا سا، بد دماغ سا، احمقانہ حد تک سٹیٹس کونشئس۔''

میری پیشانی شکن آلود ہوگئی تھی۔

جونہی وہ اندر داخل ہوئی۔ میں نے بھی ہانک لگائی۔ ''ہے ایک میری کزن۔ نری کریک پانڈا، ہیومن رائٹس کی علمبردار، مساوات محمدیؐ کی قائل، دسترخوان پر گھر کے ملازموں کو ساتھ بٹھانے اور اُن کے دُکھ سکھ میں اُن کے ساتھ کھڑی ہونے والی۔ مجھے سخت چڑ ہے اُس سے اور اُس کی فلاسفی سے۔''

دفعتہً میں نے دروازے کی جانب دیکھا۔ ''ہیرالڈ'' میرے ہاتھوں سے چُھٹ کر قالین پر گر گیا۔ ایک لڑکی دہلیز پر پردہ تھامے کھڑی تھی۔ کیسا چہرہ تھا۔ کیا قدبُت تھا۔ یوں لگا جیسے اُستاد اللہ بخش کا کوئی شاہکار دروازے پر آویزاں کر دیا گیا ہو۔

میری کزن صوفے کی بیک پر ہاتھ رکھتے ہوئی بولی:

''ارے تو تم گھر میں ہو۔ میں تو سمجھی تھی کہیں آوارہ گردی پر نکلے ہوئے ہوں گے۔''

اس کے اس مذاق کو میں نے قطعی پسند نہ کیا۔ میں جواب اپنے باپ کے چھوڑے ہوئے ایک بہت بڑے ٹیکسٹائل پروجیکٹ کا مینیجنگ ڈائریکٹر ہوں۔ رُکھائی سے میں نے کہا۔

سلمیٰ اعوان

”جان چھوڑ دو میرے بچپن کی اب وہ کہیں بہت پیچھے رہ گیا ہے۔“

وہ ہنسی۔

”جناب نے غصہ کیا ہے۔ اچھا چھوڑو ان سے ملو“ اُس نے اپنے ساتھ آنے والی لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

اور مجھے معلوم ہوا کہ تابناک چہرے والی وہ لڑکی جو بڑی آہستگی سے چلتی ہوئی دائیں ہاتھ والے صوفے پر بیٹھ گئی تھی اور جس نے آبی رنگ کا نفیس کشمیری کڑھت کا سُوٹ پہن رکھا تھا اور بڑی لیے دیئے سی نظر آرہی ہے ثالیہ ہے۔ فزکس جیسے خشک مضمون میں ایم ایس سی ہے۔ پشاور سے تبدیل ہو کر آئی ہے اور مقامی گرلز کالج میں لیکچرار ہے۔ ایسی دھان پان سی لڑکی اور فزکس کی لیکچرار۔ اچھے گھرانے سے ہے تو نوکری کی کیا ضرورت تھی؟ وہ بھی گھر سے اتنی دُور۔ میں نے تنقیدی جائزہ لیا۔ اُس کے چہرے پر چھائی بے نیازی اور غرور کا سا احساس۔ مجھے احساس ہوا کہ اُس کا تعلق کسی غریب گھر سے ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کا چہرہ اس کی امارت کا غماز تھا۔

اصل میں میری اس سرپھری کزن جیسی ہی ہوگی جو کروڑ پتی شوہر کے ہوتے ہوئے بھی نوکری کرتی اور اُسے بہت اچھا سمجھتی ہے۔

آصفہ کے ساتھ ہی وہ بھی اُٹھ گئی تھی۔ دونوں میری ماں سے ملنے چلی گئی تھیں۔

”ثالیہ“ میں نے زیر لب دُہرایا۔

یہ اُس کا نام تھا جسے دُہراتے ہوئے ذرا بھی غنائیت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ بڑا فضول سا نام ہے۔ میں نے اپنے آپ سے کہا تھا مگر چند لمحے غور کرنے کے بعد مجھے یوں لگا جیسے یہ منفرد سا نام اُس کی شخصیت ہی کی طرح ہو۔

اپنی کزن کے ہاں مجھے اُسے دیکھنے کا اکثر اتفاق ہوتا۔ اُسی کی زبانی مجھے پتہ چلا تھا کہ وہ بہت اُونچے گھر کی لڑکی ہے۔ ماں کم عمری میں مر گئی۔ باپ نے دوسری شادی کر لی۔ وہ ہوسٹلوں ہی میں پلی بڑھی۔ ہمارے گھر بھی اکثر آتی۔ دو تین بار مجھے بھی اُسے چھوڑنے ہوسٹل جانا پڑا۔ حُسن کیا تھا کہ جیسے گرما کی چاندنی رات کی فسوں خیزی کھیتوں کھلیانوں میں بکھری پڑی آنکھوں کو سحر زدہ سی کرے۔

ایسے ہی دنوں میں میری ماں نے مجھ سے کہا تھا۔

”تمہاری نخریلی ناک تلے کوئی لڑکی نہیں آتی۔ گھمنڈی پن کو چھوڑ دو اب۔ سنجیدگی سے اِس ہیرا سی لڑکی کے بارے میں سوچ لو۔ مجھے غصہ آیا تھا۔

”نہ اتہ نہ پتہ۔ کس خاندان۔ کس قبیل سے ہے جانتی ہیں؟“

”انسان کو پرکھنے کا شعور ہے مجھے۔“ جواباً انہوں نے اُسی تختی سے کہا۔

اس کے لیے ہمارے گھر میں میری ماں اہم تھی۔ میں تو قطعی قابلِ توجہ نہ تھا۔ اس کی اسی چیز نے میرے پندارِ غرور کو ٹھیس پہنچائی تھی۔

اب اگر یہ کہوں کہ مجھے اس سے محبت ہوگئی تھی تو غلط نہ تھا۔ اس کا حُسن، تہذیب اور شائستگی ایک مرد کو دیوانہ بنانے کے لیے کافی تھیں اور میں دیوانہ ہو چکا تھا۔ جب میں نے اس سے شادی

کرنے کے ارادے کا اظہار اپنی کزن سے کیا تو وہ ہنس کر بولی:

''چلو خدا کا شکر ہے تمہارا کفر تو ٹوٹا۔''

''تو تم اُس سے بات کر کے اُس کا عندیہ تو لو۔'' میں نے درخواست کی۔

''غلط بات۔ شادی تم نے کرنی ہے۔ تمہی پوچھو۔ میں کون؟ خواہ مخواہ۔''

آصفہ ان دنوں چھٹی پر تھی۔ میں ہوسٹل کے دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے اُسے بلایا تھا آصفہ کا نام لے کر۔ وہ آئی اور خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ راستے میں بغیر کسی تمہید کے میں نے اُس سے کہا کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔

اُس نے عجیب سے انداز میں مجھے دیکھا اور رُکھائی سے بولی۔

''مگر میں تو نہیں چاہتی۔''

میں تو یکدم جیسے سناٹے میں آ گیا۔ کچھ بولا ہی نہ گیا۔ یہ سوچ تو قرین قیاس ہی نہ تھی کہ میں بھی رد کیا جا سکتا ہوں؟

انا پر جیسے ہتھوڑے پڑے اور اس سوال نے بڑی مکروہ صورت کے ساتھ میرے منہ پر تھپڑ مارا تھا۔

میرے منت سماجت پر آصفہ نے اُس کے ترلے کیے۔ پھر اُس نے سوچنے کا وقت مانگ لیا۔ اس کی سوچ بہت لمبی ہو گئی تھی۔ ایک طرح ناک سے لکیریں نکلوانے والی بات ہو گئی۔ چھ ماہ گزر گئے۔ میں کئی بار ہوسٹل گیا مگر وہ مجھے نہیں ملی۔ بالآخر آصفہ نے ایک دن بتایا کہ وہ سخت تذبذب کا شکار ہے۔ اگر وہ اپنی مرضی سے شادی کرتی ہے تو اُس کا والد شادی میں شریک نہیں ہوگا۔ ''میری مانو تو نکاح پڑھا لو۔ ایسی اچھی لڑکی تمہیں زندگی میں نہیں ملے گی۔'' آصفہ نے مجھے گومگو کی کیفیت سے نکالتے ہوئے کہا۔

شادی سے پہلے اُس نے شرط لگا دی کہ وہ نوکری نہیں چھوڑے گی۔

''احمق''۔ میں نے قدرے غصّے سے آصفہ سے کہا۔ ''یہ عورتوں کو اپنی کمائی کی چاٹ کیوں لگ جاتی ہے؟''

''تمہاری کھوپڑی میں آخر سیدھی بات کیوں نہیں آتی۔ علم بانٹنے کی چیز ہے۔ بند کر کے زنگ لگانے کی نہیں۔''

پھر میں اُسے بیاہ لایا۔ بارات تو آصفہ کے گھر سادگی سے گئی مگر ولیمہ بڑا شاندار ہوا۔ میری ماں نے اپنے دل کے خوب ارمان نکالے۔ وہ بے چاری تو مایوس ہو چکی تھی کہ میں کبھی شادی بھی کروں گا۔

میری زندگی میں آ کر وہ اتنی اچھی بیوی اور بہو ثابت ہوئی کہ انسان اپنے مقدر کی خوش بختی پر رشک کر سکتا تھا۔ میرا خوبصورت گھر اُس کے ہاتھوں کی محنت اور سلیقے نے اور خوبصورت بنا دیا۔ کھانوں میں لذت آ گئی تھی۔ دفتر ہو یا گھر تقریباً ہر معاملے میں اُس کی رائے بڑی سوچی سمجھی ہوتی۔ میری ماں جو بیماریوں کا ملغوبہ تھی، اُس کی دیکھ بھال سے اُس کی حالت بہت بہتر ہو گئی تھی۔ مگر اُس کی ایک عادت سے مجھے شدید نفرت تھی وہ تھی شاگرد پیشہ لوگوں سے اُس کا میل جول۔ مالی، خانساماں، ڈرائیور اور چوکیدار کی گھر والیاں بلا روک ٹوک گھر میں آنے لگی تھیں۔ جب بھی میں نے اس کی اس روش پر تنقید کی، اُس

نے جواباً کہا وہ انسان ہیں اور ہم سے اچھے سلوک کے مستحق ہیں۔

''میں نے کب کہا کہ وہ جانور ہیں۔ میں چیخ اُٹھتا۔ ''میرا کہنے کا مطلب ہے کہ تمہیں اپنے مقام کا خیال رکھنا چاہیئے۔ گندی عادتیں میری ماں جیسی۔ سچ تو یہ ہے بوٹے پہ بوٹا لگ گیا ہے۔''

میں نے اُس کی تنخواہ کے بارے میں کبھی نہیں پوچھا تھا کہ وہ کیا کرتی ہے اور کہاں خرچ کرتی ہے؟ شاید اس لیے کہ میں اربوں کا مالک تھا۔

ہاں البتہ جب تک وہ ماں نہیں بنی تھی، میں کبھی کبھی اُسے اُداس اور متفکر سا دیکھتا مگر جب سے اُس نے دو جُڑواں بچوں ایک لڑکے اور ایک لڑکی کو پیدا کیا تھا وہ بڑی بدل گئی تھی۔ کالج سے بھی زیادہ تر چھٹی پر رہنے لگی تھی۔

اپنے ماں باپ اور عزیزوں رشتہ داروں کے بارے میں مَیں نے اُسے بہت کم بات کرتے سُنا۔ میرا خیال تھا کہ سوتیلی ماں اور باپ کی عدم توجہی نے اُسے دل برداشتہ کیا ہوا ہے جبھی وہ اُن کا ذکر کرنا پسند نہیں کرتی۔

پچھلے دو تین دنوں سے میرے پیٹ میں درد تھا۔ ثالیہ کو میں نے نہیں بتایا۔ اصل میں وہ میری ذرا سی تکلیف پر اتنی پریشان ہو جاتی تھی کہ مجھے افسوس ہوتا۔ پروجیکٹ پر نیا ڈاکٹر آیا تھا۔ پشاور کی کسی نواحی بستی سے تھا۔ بڑا خوش اخلاق آدمی تھا۔ عُمر یہی پچاس پچپن سال ہوگی۔ تفصیلی معائنے کے بعد دوا دیتے ہوئے بولا:

''فکر کی بات نہیں۔ معمولی درد ہے۔ ٹھیک ہو جائے گا۔''

تولیے سے اپنے ہاتھوں کو صاف کرتے ہوئے اُس نے پھر کہا:

''شجاع صاحب یہاں گرلز کالج میں ہماری بستی کی ایک لڑکی ہے۔ ثالیہ نام ہے۔ اُس کے گھر والوں نے کچھ چیزیں میرے ہاتھ بھیجی تھیں۔ بہت دن ہو گئے ہیں۔ اگر آپ کسی وقت مجھے اپنا ڈرائیور گاڑی دے دیں تو مہربانی ہوگی۔''

میرا اُوپر کا سانس اُوپر اور تلے کا تلے رہ گیا۔

''ثالیہ''۔ میں نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ''پڑھتی ہے کیا؟''

''نہیں پڑھاتی ہے شاید۔ فزکس کی لیکچرار ہے۔ بڑی ہونہار لڑکی ہے۔ باپ پنجاب کے کسی گرلز سکول میں چپڑاسی تھا۔ بیٹی کو پڑھنے کا شوق تھا۔ لہٰذا پڑھایا۔ برسرِ روزگار ہوئی تو باپ کی نوکری چھڑوا دی اور اُنہیں گاؤں لے آئی۔ دو بہن بھائی میڈیکل کے چوتھے سال میں ہیں۔ ایک بہن بیالوجی میں ایم۔ ایس سی کر رہی ہے۔''

وہ اپنی دُھن میں بولے جا رہا تھا اور نہیں جانتا تھا کہ اُس کا بولا ہوا ہر لفظ جیسے میرے سر پر کسی وزنی ہتھوڑے کی مانند پڑ رہا ہے۔ میرا رنگ پیلا پڑ گیا ہوگا جبھی تو ڈاکٹر نے حیرت سے کہا ''ارے آپ کو کیا ہو گیا ہے؟''

بمشکل اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے میں نے کہا۔

''یہی تو تکلیف ہے ڈاکٹر۔ ایکا ایکی درد اُٹھتا ہے اور بے چین کر جاتا ہے۔''

''پریشان نہ ہوں۔ جا کر آرام کیجیے، پھر کسی روز دیکھا جائے گا۔''

میں نہیں جانتا۔ میں گاڑی میں کیسے بیٹھا؟ مجھے تو بس ایک ہی بات یاد تھی۔ میری بیوی چپڑاسی کی بیٹی ہے۔ نچلے طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔ درمیان کی سب باتیں میں بھول گیا تھا۔

گھر آیا۔ گاڑی پورچ میں کھڑی کی۔ خدا کا شکر تھا کہ میں کسی حادثے سے دوچار نہیں ہوا۔ وگرنہ جس ذہنی پریشانی سے میں ایکا ایکی دوچار ہوا تھا وہ کسی بھی خطرے کا باعث بن سکتی تھی۔

برآمدے میں نور ہمارا نوکر کھڑا تھا۔ بریف کیس میرے ہاتھوں سے پکڑتے ہوئے اُس نے مجھ سے چائے لانے کا پوچھا۔

''وہ کہاں ہے؟'' میں نے حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھا۔

ڈیڑھ سال کی ازدواجی زندگی میں ایسا ایک بار بھی نہیں ہوا تھا کہ میری گاڑی رُکنے کی آواز پر وہ باہر نہ نکلی ہو، اُس کے ہونٹوں نے پیار بھری مسکراہٹ نہ بکھیری ہو۔

نور شاید میری نگاہوں کا مفہوم سمجھ گیا تھا۔ بولا ''بیگم صاحبہ بڑی بیگم صاحبہ کے ساتھ گئی ہیں۔

مجھے یاد آیا کہ آصفہ کے چچا کی بیٹی کی شادی تھی۔ عالیہ نے دو تین دن پہلے اُس کا ذکر کیا تھا۔ آج صبح بھی اُس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ میرے آنے تک چلی جائے گی۔ ایک دن وہاں ٹھہرنے کا سُن کر میں بولا تھا۔

''کوئی ضرورت نہیں۔ تم نے مجھے اپاہج بنا دیا ہے۔ مجھے تو تمہارے بغیر کچھ نظر ہی نہیں آتا۔''

پر اب اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے میں نے سوچا اچھا ہی ہوا وہ نہیں ہے۔ مجھے اِس وقت مکمل سکون کی ضرورت ہے۔

اُس نے جھوٹ بولا۔ میرے ساتھ فریب کیا۔ خود کو وہ کچھ ظاہر کیا جو وہ نہیں تھی۔ ایسا اُس نے صرف مجھے پھانسنے کے لیے کیا۔ میں جو اربوں کی جائیداد کا تنہا وارث ہوں۔ گزرے ہوئے وقت کا ایک ایک لمحہ میری آنکھوں کے سامنے آیا۔ میں ہی پاگل تھا۔ عشق نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی، وگرنہ اس کی عادتیں دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا، اس میں امیرزادیوں والی کوئی بات نہ تھی۔

پورا دن میں سُلگتا نہیں جلتا رہا۔ وہ ابھی نہیں آئی تھی۔ باوجود شدید نفرت کے شعوری طور پر جیسے مجھے اُس کی آمد کا انتظار تھا۔ دوسری شام میں نے کلب میں گزاری۔ وہیں حبیب الرحمٰن ملا۔ اس کا کاروبار سنگاپور، ملایا اور انڈونیشیا تک پھیلا ہوا تھا۔ تقریباً سال بھر سے وہ باہر تھا۔ خوب گلے لگ کر ملا۔ یار دوستوں نے اُسے میری شادی اور جُڑواں بچوں کا بتا دیا تھا۔ خوب ہنسا اور بولا۔

''بھئی سُنا ہے تمہاری بیوی خوبصورت ہی نہیں پڑھی لکھی بھی بہت ہے۔''

میرے کلیجے پر جیسے چھُری چل گئی۔ ابھی کچھ بولا بھی نہ تھا کہ اُس نے خود ہی کہا۔ ''ارے شجاع تمہیں سلیمان تو یاد ہوگا۔''

''یاد کیوں نہیں وہی جس کا دیوالیہ ہو گیا تھا۔''

''ہاں ہاں ارے بھئی دیکھو نا انقلاب زمانہ۔ وقت کا کروڑ پتی آدمی آج کا بھکاری۔ میں پچھلے دنوں لندن گیا تو اُس کی خستہ حالی دیکھ کر

میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے- پانچ ہزار پونڈ اُسے دیئے کہ وہ چھوٹا موٹا کام کرے- زندگی میں واقعی کسی چیز کا اعتبار نہیں-''

وہ سلیمان کے عبرت ناک انجام سے بہت زیادہ متاثر تھا- دیر تک اس کی باتیں کرتا رہا-

پھر طوفان آیا- میں نے اُس کے چیتھڑے کرڈالے- مکار، دغاباز ایک امیرزادے کو پھانسنے، اس پر اپنے حُسن سے ڈورے ڈالنے کا الزام، خود اپنی سادگی اور حماقت کا اعتراف- میرے تو جیسے تلووں سے کھوپڑی تک آگ ہی آگ برس رہی تھی-

اُس نے پیلے پڑتے چہرے اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ سب سُنا اور پھر جیسے ڈوبتی آواز میں بولی- ''میرا باپ چپڑاسی تھا، غریب ہے مگر حسب نسب والا ہے- غریبی کوئی طعنہ نہیں میاں نہیں اور وہ تمہارے باغ باغیچوں کو ہرا بھرا کرنے والا اور تمہاری ماں کی خدمت پر مامور اس کی بیوی بھی بڑی عظمت والی تھی کہ جنھوں نے ایک گھنٹے کا اپنا لختِ جگر تیرے والدین کی گود میں ڈال کر تیرے باپ کے بانجھ پن کو اپنے بڑے پَن سے ہرا بھرا کر دیا تھا-''

جیسے ایکا ایکی زمین اپنے محور پر گھوم جائے- جیسے ہر چیز اُلٹی قلابازیاں کھانے لگ جائے، جیسے طوفان آجائے، جیسے ساحل پر بیٹھے خوش و خرم لوگوں کو سونامی دبوچ لے- تمہیں تمہیں --- میں ہکلا رہا تھا- الفاظ جیسے میرا ساتھ چھوڑ گئے تھے-

''اپنی ماں کے پاس جاؤ-''

اور میں سرپٹ بھاگتا دھڑام سے اُس کے کمرے میں داخل ہوا- میرے تعاقب میں وہ بھی بھاگتی ہوئی آموجود ہوئی تھی-

میں نے سر اس کی گود میں پھینکا-

''میں کیا سُن رہا ہوں؟'' میری ماں نے تڑپ کر میرا سر اُوپر کیا اور جیسے چھری میرے کلیجے میں اُتار دی- ''جس راز کو تیرا باپ قبر میں لیے اُتر گیا اور جسے میں اپنے سینے میں لیے بیٹھی ہوں اُسے زبان مت دو- دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں-''

''تو پھر یہ تیسرے کے پاس کیوں پہنچا؟''

''تیرے علاج کے لیے- نخوت و تکبر میں تُو اپنے باپ سے بھی چار ہاتھ آگے چلا گیا ہے- تین لفظوں کے ساتھ چار زندگیاں داؤ پر لگ جاتی تھیں-''

میں نے کہا نا- میں گھائل تھا- خون اُترا ہوا تھا آنکھوں میں- میں بھاگا اپنے کمرے میں آیا اور اُسے لاک کر لیا-

خوبصورت آنکھوں میں خدشات کا طوفان تھا- ہونٹ کانپتے تھے -ہاتھ برف جیسے ٹھنڈے تھے-

کہیں جو ڈی این اے کے چکروں میں پڑ گیا تو- اور ساس نے بہو کے پیلے پھٹک چہرے کو دونوں ہاتھوں کے پیالے میں تھامتے ہوئے سرگوشی کے سے انداز میں کہا تھا-

''حوصلہ رکھو میں نے اُسے جنا ہے- جانتی ہوں کتنے پانی میں ہے؟ جو ڈوز ہم نے دے دی ہے وہ بہت موثر ہے-''

☆☆☆☆☆

شاہ داستان

سید شوکت علی شاہ، ضلع اٹک کے دور افتادہ قصبے تلہ گنگ میں پیدا ہوئے، پنجاب یونیورسٹی اورگورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے سیاسیات اور قانون کی ڈگری لی۔ بعد میں یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلیز سڈنی آسٹریلیا اور AIT تھائی لینڈ میں تعلیم حاصل کی۔ ان کا تعلق صوبائی سول سروس سے ہے۔

مصطفیٰ زیدی نے کہا "افسروں میں انھیں شاعر سمجھا جاتا ہے اور شاعروں میں افسر گردانا جاتا ہے۔ شاہ صاحب کی خوبی یہ ہے کہ افسروں میں انھیں اعلیٰ درجے کا ایڈمنسٹریٹر اور ادیبوں میں صفِ اول کا ادیب جانا جاتا ہے۔

شاہ صاحب پنجاب کے مختلف اضلاع میں دس سال تک ڈپٹی کمشنر رہے۔ کمشنر بہاول پور، ممبر پبلی کیشن سروس کمیشن، ممبر بورڈ آف ریونیو سیکرٹری انفارمیشن حکومت پنجاب اور چیئرمین لاہور آرٹس کونسل رہے۔

ان کی نو کتابیں منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ زیرِ طبع کتاب 'شاہ داشان' تجسس اور تحقیق کے کئی در وا کرتی ہے۔ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے نامور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا اُس کتاب کے مقابلے میں مجھے اپنی سوانحِ عمری Min iature لگتی ہے۔

شوکت علی شاہ

غلام حیدر وائیں کا شعری ذوق:

وائیں صاحب میٹرک پاس تھے لیکن ہمیشہ فخر سے بتاتے کہ وہ پرانے زمانے کے دس جماعت پاس ہیں جو آج کل کے بی اے سے بہتر تھا۔ ایک طویل عرصہ تک سیاست کی کٹھناؤں میں چل کر انہیں فن تقریر آ گیا تھا۔ تقریر کرتے وقت مجمعے کی نفسیات کو ذہن میں رکھتے۔ جس طرح غالب نے کہا تھا:

ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

.....

اسی طرح اُردو تقریر بغیر موزوں اشعار کے مکمل نہیں ہوتی۔ عطا اللہ شاہ بخاری ان کے مریدان خاص،

شورش کاشمیری وغیرہ کی تقریر دل پذیر کا راز بھی برمحل اور برجستہ اشعار میں تھا۔ شاہ صاحب تو خوش الحان تھے۔ ترنم سے پڑھتے تو سونے پر سہاگا ہوتا۔ شورش کاشمیری کی آواز اچانک بجلی کی طرح وزنی تھی - الفاظ کا زیرو بم، فقروں کی نشست و برخاست، اُن کا گٹھیلا پن، ایک قدرتی، گونج اور دھمک سے سامعین سحرزدہ ہو جاتے۔

وائیں صاحب اس پایہ کے مقرر تو نہ تھے لیکن معروضی حالات میں تقریر کا جادو چلا لیتے۔ ہر دو چار منٹ کے وقفے کے بعد ایک آدھ شعر بھی چھوڑ دیتے۔ ہفتے میں کم از کم ایک دن وہ میاں چنوں جانے کے لئے ملتان آتے۔ اپنی آمد پر پریس کانفرنس سے ضرور خطاب کرتے۔ ان کا حکم تھا کہ صرف چیدہ چیدہ صحافیوں کو نہ بلایا جائے بلکہ مقامی پریس کو بھی مدعو کیا جائے۔ نتیجتاً شعلہ، چنگاری، چمک، دھمک اور رمق قسم کے اخباروں کے نمائندے بھی پہنچ جاتے۔ ساٹھ ستر صحافیوں کی موجودگی میں پہلے تو وہ تقریر کرتے اور پھر سلسلہ سوال و جواب شروع ہوتا۔ انتظامیہ کے لئے یہ بہت نازک مرحلہ ہوتا۔ اتنے سارے لوگوں کو خوش رکھنا خاصا مشکل کام ہوتا ہے لیکن ہم حتی المقدور کوشش کرتے اور سینڈوچ، کیک پیسٹری اور رس ملائی سے ان کی تواضع کرتے۔ کوئی انتظامیہ بھی نہیں چاہتی کہ منہ پھٹ صحافی اس کے خلاف لب کشائی کرے۔

اگلے دن ان کی تقریر صفحہ اوّل پر جلی حروف میں چھپتی، جس میں وہ شعر بھی ہوتے جو انہوں نے نذر عوام کیے ہوتے۔ ایک مرتبہ نواب زادہ نصراللہ نے کہہ دیا کہ وائیں صاحب کو شعر پڑھنے کا تو بڑا شوق ہے لیکن ان کے اکثر اشعار بے وزن ہوتے ہیں۔ نواب زادہ نے ان کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ جب تک تقریر سے پہلے شاعر کا دیوان نہ دیکھا جائے تو اکثر کاکی یا یوں کا فرق نکل ہی آتا ہے۔ وائیں صاحب کے پاس اتنا وقت کہاں تھا کہ ایک شعر کے لئے پورا دیوان کھنگالتے۔

ایک دفعہ ملتان میں انہوں نے جلسہ عام سے خطاب کرنا تھا۔ سیاسی جلسہ تھا۔ نواب زادہ کے اعتراضات کو باطل کرنے کا نادر موقع تھا۔ جب وہ ایئرپورٹ پر جہاز سے اُترے تو میں نے ایک چٹ پر چند حسب حال شعر لکھ کر چپکے سے ان کے ہاتھ میں تھما دیے۔ انہوں نے بڑے غور سے شعروں کو پڑھا اور مجھے قریباً ڈانٹتے ہوئے بولے "تمہیں اب خیال آیا ہے جب نواب زادہ ہاتھ کر گیا ہے۔"

ضلع کونسل کے الیکشن: وائیں صاحب کے ذہن رسا کے قافلے ہمیشہ سیاسی راہوں پر گامزن رہتے۔ اس وقت صورت حال یہ تھی کہ پارٹی کے بیشتر رکن اسمبلی ضلع کونسل کے چیئرمین بھی تھے۔ وہ خاصے طاقت ور تھے اور اکثر من مانی کرتے اور صوبائی حکومت کو خاطر میں نہ لاتے۔ اس طرح پارٹی ورکروں میں بھی بددلی پھیلتی جنھیں وہ اپنا اصل سرمایہ سمجھتے تھے۔ ان دو عہدوں کو الگ کرنے کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ زیادہ کارکنوں کو اقتدار کے ایوانوں میں آنے کا موقع ملتا۔

اس تناظر میں جب انہوں نے ضلع کونسل اور

میونسپل، ٹاؤن کمیٹیوں کے الیکشن کرانے کا ارادہ ظاہر کیا تو اس کی مخالفت میں ایک طوفان کھڑا ہو گیا۔ اصل وجہ نزاع یہ تھی کہ نئے قانون کی رُو سے ضلع کونسل کی چیئرمینی کو اسمبلی کی ممبری سے الگ کر دیا گیا تھا۔ بے شمار ممبر میاں نواز شریف کو ملے اور وائیں کے خلاف خوب زہر اُگلا۔ وہ میاں چنوں میں تھے کہ شہباز شریف کا فون آ گیا۔ اس نے انہیں اپنے ارادے سے باز رکھنے کی پوری کوشش کی۔ ممبران اسمبلی کے اعتراضات بتائے اور سیاسی مضمرات پر روشنی ڈالی۔ وائیں صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے۔ اُلٹا اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ نئے سسٹم کے تحت صرف پارٹی ہی نہیں ملک و قوم کا بھی فائدہ ہوگا۔ کافی دیر تک بحث و تمحیص ہوتی رہی۔ ہر دو اصحاب اپنا اپنا نکتہ نظر پیش کرتے رہے۔ آخر میں جب برادر خورد نے دیکھا کہ اس کی دال نہیں گل رہی تو وہ دھمکی پر اُتر آیا۔ غصے میں کہنے لگا "وائیں صاحب! آپ کے لئے ہم پچاس ممبران اسمبلی کو ناراض نہیں کر سکتے۔ الیکشن فی الفور نہیں ہو سکتے البتہ ایک سال کے بعد سوچا جا سکتا ہے۔"

"تو اس ایک سال کے عرصے میں غلام حیدر وائیں وزیر اعلیٰ نہیں ہوگا کسی اور شخص کا انتخاب کر لیں۔" یہ کہہ کر انہوں نے فون بند کر دیا۔

لیکن اس کی نوبت نہ آئی۔ بات میاں نواز شریف تک پہنچی انہوں نے کہا وائیں صاحب کی خواہش کا احترام کیا جائے۔

ملتان میں الیکشن شروع ہوئے تو گیلانیوں اور قریشیوں کی پرانی دشمنی بھی عود کر آئی۔ ایک طرف حامد رضا گیلانی، تنویر گیلانی، فخر الدین شاہ اور شجاع آباد کا نواب لیاقت تھا تو دوسری طرف شاہ محمود اپنے رفقا کے ساتھ تن کر کھڑا تھا۔ یوسف رضا گیلانی کی اپنے چچا سے ان بن تھی لیکن شاہ محمود سے "لو افیئر" بھی ابھی ابتدائی مراحل میں تھا۔ الیکشن میں حامد رضا گیلانی گروپ جیت گیا۔ ضلع کونسل کی چیئرمینی کے لئے شاہ محمود گروپ کا اُمیدوار اس کا بہنوئی محمد احمد تھا۔ دوسری طرف ابھی فیصلہ نہ ہو پایا تھا۔ پانچ ارکان پر مشتمل ایک پینل بنا دیا گیا جس کے چیئرمین محترم صدیق خان کانجو تھے۔ اُس نے الیکشن سے ایک دن پہلے کسی نہ کسی کو نامزد کرنا تھا۔ دراصل حامد رضا اور کانجو کے درمیان خفیہ طور پر یہ طے پا چکا تھا کہ وہ گیلانی صاحب کے بیٹے رضا کو نامزد کریں گے۔ تاثر یہ دیں گے کہ وہ کمیٹی کا متفقہ فیصلہ ہے تاکہ کوئی اعتراض نہ کر سکے۔ بہت کم لوگوں کو علم تھا کہ حامد رضا گروپ کے اندر بھی گروہ بندی ہے اور دو مؤثر گروپ فخر الدین شاہ اور نواب لیاقت ایک دوسرے کی شکل دیکھنے کے بھی روادار نہ تھے۔

شاہ محمود گروپ میں صف ماتم بچھی ہوئی تھی۔ گیلانیوں سے شکست کا خیال ہی سوہانِ روح تھا۔ الیکشن کی رات کو ایک بجے وزیر اعلیٰ کا فون آ گیا۔ بولے "وزیر اعظم نے حکم دیا ہے چونکہ دونوں مسلم لیگی ہیں اس لئے ان میں صلح کرا دی جائے۔ حامد رضا کا بیٹا چیئرمین بن جائے اور شاہ محمود کے بہنوئی محمد احمد کو وائس چیئرمینی دے دی جائے۔"

میں نے حامد رضا کو فون کر کے وزیر اعظم کی خواہش سے آگاہ کیا۔ اس وقت تک وہ

وائیں کی مہربانی سے سینیٹر بن چکا تھا۔ اس نے سوچنے کے لئے مہلت مانگی۔ میں نے کہا جتنا سوچو گے کام بگڑے گا۔ فوراً ہاں کر دو۔ کہنے لگا "پھر بھی کانجو اور دیگر ممبران سے مشورہ ضروری ہے۔" ادھر ہر دس منٹ کے بعد شاہ محمود کا فون آ رہا تھا۔ وہ بار بار ایک ہی فقرہ دہراتا Sir, Call us in your drawing room and work out the modatities (جناب والا! ہمیں اپنے ڈرائنگ روم میں بلا کر طریق کار وضع کریں)۔

حامد رضا گروپ میں کافی دیر تک بحث و تمحیص ہوتی رہی۔ کانجو صلح کا مخالف تھا اس کا خیال تھا کہ شاہ محمود بڑی مشکل سے قابو آ رہا ہے اس کی ناک رگڑنے اور سیاسی ریت میں رگیدنے کا ایسا نادر موقع پھر نہیں آئے گا۔ ساتھ ہی اس نے میرے متعلق بھی خاصی گوہر افشانی کی۔ کہنے لگا "یہ ڈپٹی کمشنر ای پی مون بننے کی کوشش کر رہا ہے۔ اسے ملتان کے معروضی حالات اور سیاست کا کیا پتہ ہے۔" وہ یکسر بھول گیا کہ یہ ای پی مون نہ ہوتا تو بجائے اسمبلی جانے کے کروڑ پکا کے کھیتوں میں ہل چلا رہا ہوتا۔ حامد رضا نے معذرت کر لی۔ میں نے وائیں کو مطلع کر دیا کہ وہ صلح کے موڈ میں نہیں ہیں۔ غصے سے بولا "جو شخص جہنم میں جانے پر تلا ہوا ہو اس کا راستہ فرشتے بھی نہیں روک سکتے۔"

صبح جب کانجو نے محمد رضا کو نامزد کیا تو فخر الدین شاہ بپھر گیا۔ اس نے سرزنش کرتے ہوئے حامد رضا کو کہا "تم نے برس ہا برس کی دوستی اور میری بزرگی کا خیال بھی نہیں رکھا اور اس کرایے کے چیئرمین سے اپنے بیٹے کو نامزد کروا دیا ہے۔ آج سے میری تمہاری دوستی ختم اور راستے جدا ہیں۔ وہ اپنے گروپ کے بارہ ممبروں کو لے کر چلا گیا۔ شاہ محمود نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور یہ طے پایا کہ وہ چیئرمین اور محمد احمد وائس چیئرمین بنیں گے۔

حامد رضا کا کھیل بگڑ چکا تھا۔ صبح اسے علی طاہر زیدی نے مشورہ دیا کہ ڈی سی کو کہہ کر الیکشن ملتوی کرا دو۔ زیدی صاحب میرے بیچ میٹ تھے۔ ان دنوں وہ حامد رضا کے مشیر عام اور مرید خاص تھے۔ ہجرت کر کے آئے اور ملتان میں بس گئے۔ ان کے والد صاحب پوسٹ ماسٹر تھے۔ کسی زمانے میں دعا مانگا کرتے کہ اللہ تعالیٰ انہیں پوسٹل سروس دے دے۔ شاید وہ قبولیت کا لمحہ تھا سنٹرل سروس میں انہیں پوسٹل سروس ہی ملی لیکن انہوں نے لفافوں پر ٹکٹ لگانا پسند نہ کیا۔ اس اثنا میں پی سی ایس کا امتحان بھی پاس کر چکے تھے چنانچہ مجسٹریٹ بن گئے۔

وضعداری کا یہ عالم تھا کہ مخدوم صاحب کے گھٹنے چھو کر اپنے ہاتھ کو چومتے۔ زبان کے بڑے میٹھے تھے۔ جب بھی کوئی شخص ملنے آتا تو باقاعدہ اُٹھ کر اس سے بغلگیر ہوتے۔ چیونٹی کے گھر پروھان آ گیا ہے۔ یہ کمرہ بقعہ نور بن گیا ہے، آج تو مجھے کچھ بانٹنا چاہئے۔ اس شخص کے جاتے ہی لفظوں کی خیرات بانٹ دیتے۔ ایک تگڑی سی لکھنوی گالی دے کر کہتے "حرام زادے آ جاتے ہیں وقت ضائع کرنے۔ ہزار سرکاری کام مرک جاتے ہیں۔ پتہ نہیں اس قوم کو احساس زیادہ کب ہوگا۔"

مخدوم صاحب کی تابعداری کی ایک معقول وجہ بھی

تھی۔انہوں نے ہی اسے ڈی سی مظفر گڑھ لگوایا تھا۔ اس سے پہلے کچھ عرصہ کے لئے میانوالی کی ڈپٹی کمشنری کر چکے تھے۔اس وقت گل حمید روکڑی محدو معاون ثابت ہوا۔ بعد میں گلہ کرتا رہا کہ یہ شخص پوسٹنگ سے پہلے یقین دلاتا تھا کہ میری خاطر دریا عبور کر جائے گا، پہاڑ پھلانگ لے گا، ہوا میں اڑنا پڑا تو اپنے انتظامی پر پھڑ پھڑائے گا۔ جب لگوا دیا تو میونسپلٹی کی نالی ناپنے سے بھی گریزاں ہے۔

میانوالی زیادہ دیر نہ ٹھہر سکے۔ کسی نے ان کی کوٹھی کے لان میں پٹاخہ پھینک دیا۔ یہ اس وقت سرگودھا میں کمشنر کی میٹنگ میں تھے۔ خبر ملتے ہی انہوں نے واپس جانے سے انکار کر دیا۔ ان کے خیال میں وہ پٹاخہ نہیں بلکہ بم تھا۔ جب لاہور پہنچے تو مستعد عملے نے گھر کا سامان پہلے ہی پہنچا دیا تھا۔

ڈپٹی کمشنری چیز ہی ایسی ہے کہ بار بار اس کوئے ملامت کا طواف کرنے کو جی چاہتا تھا۔ زیدی نے بڑا سوچ سمجھ کر مشورہ دیا تھا۔ ایک تو اسے ملتان میں میری موجودگی کا قلق تھا۔ سروس میں اس قسم کی چپقلشیں چلتی رہتی ہیں، دوسرا اس کے لئے ملتان پوسٹنگ کرانے کا وہ نادر موقع تھا۔ وہ میرا مزاج شناسا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ میں کسی صورت بھی الیکشن ملتوی نہیں کروں گا۔ حامد رضا ہار جائے گا اور وائیں سے دیرینہ مراسم کے ناطے میرا تبادلہ کرا دے گا۔ ویسے بھی وقتاً فوقتاً ان کے کانوں میں وسوسے ڈالتے رہتے تھے۔ اسے کہتے میری شاہ محمود سے مخاصمت محض دکھاوا ہے، اندر کھاتے ہم دونوں ایک ہیں۔

زیدی صاحب کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے حامد رضا نے الیکشن کو ملتوی کرنے کا دبے دبے لفظوں میں مطالبہ کیا۔ فخر الدین شاہ کو راضی کرنے کے لئے اسے کچھ دنوں کی مہلت چاہئے تھی۔ میں نے صاف انکار کر دیا۔ کانجو بھی ان کے ساتھ تھا۔ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا "تم نے مجھے ای پی مون کہا ہے۔ کیا تمہیں علم ہے کہ اس کا طریقہ کار کیا تھا؟ اُس نے تمام سروس میں کوئی غلط کام نہیں کیا تھا۔ مجھے کم از کم کوئی کام تو ٹھیک کرنے دو۔" وہ ناراض ہو کر چلے گئے۔

دفتر پہنچا تو وزیر اعلیٰ کا فون آ گیا۔ کہنے لگے "شاہ محمود کو میری طرف سے پیغام دو کہ وہ حامد رضا گیلانی کا ساتھ دے۔" بظاہر یہ بڑا احمقانہ حکم تھا لیکن میں اس کا مفہوم سمجھتا تھا۔ حامد رضا نے فون کر کے انہیں الیکشن کے التوا کا کہا ہوگا۔ وائیں بڑا زیرک شخص تھا۔ اسے علم تھا کہ ایسا ممکن نہیں ہے لہٰذا اس نے مخدوم صاحب کی تشفی کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا۔ میں مرزا محمد علی کو لے کر ضلع کونسل کے دفتر پہنچا۔ وہاں شاہ محمود اور یوسف رضا گیلانی کھسر پھسر کر رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر یوسف رضا کے کان کھڑے ہوئے۔ الیکشن میں نصف گھنٹہ رہ گیا تھا۔ میں نے شاہ محمود کو کہا تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ یوسف رضا کو میں نے کہا کہ وہ کمرے سے باہر چلا جائے۔

بولا "ہم ایک ہیں جو کچھ کہنا ہے میری موجودگی میں کہو۔"

اب "Will you please go out"

کے میں نے سخت لہجے میں بات کی۔ اس نے شاہ محمود کی طرف دیکھا اور اُٹھ کر باہر چلا گیا۔ میں نے وزیراعلیٰ کا پیغام دیا۔

کہنے لگا "وائیں صاحب بادشاہ آدمی ہیں۔ رات کو میں منت سماجت کرتا رہا۔ اس وقت تو حامد رضا کا دماغ ساتویں آسمان پر تھا، اب زمین پر کیسے آ گیا ہے۔ میرے لئے یہ ممکن نہیں ہے۔ میرے سپورٹر They will lunch me (میرے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے) میں نے وائیں صاحب کو صورت حال سے آگاہ کیا اور الیکشن کرا دیئے۔

عالمی اُردو کانفرنس و عالمی مشاعرہ: پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد ہماری قومی زبان اُردو نے جس طرح کسمپرسی کے عالم میں کبھی انصاف طلب نگاہوں سے ارباب بست وکشاد کو دیکھا ہے اور کبھی امداد طلب نظروں سے اہل وطن کو پکارا ہے، وہ ہماری قومی تاریخ کا ایک المناک باب ہے۔ خاص طور پر مغرب زدہ طبقے نے جو غیریت، مخاصمت اور عدم توجہی اس زبان کے ساتھ روا رکھی ہے، اس کی کہیں مثال نہیں ملتی۔ ایک طویل جدوجہد اور قربانیوں کی خونچکاں داستان رقم کرنے کے بعد نئی مملکت تو وجود میں آ گئی لیکن فکر ونظر آزاد نہ ہو سکے۔ غلامانہ ذہنیت نہ بدلی، حاکمانہ روش سرگشتہ خمار رسوم و قیود رہی۔ ایک انتہائی قلیل لیکن منظم گروہ پیر تسمہ پا کی طرح قوم کے حواس اور اعصاب پر سوار رہا۔

پاکستان غالباً واحد ملک ہے جہاں پرائمری جماعت میں اُردو کا پڑھنا لکھنا معیوب سمجھا جاتا رہا۔ کسی کی علمیت کی تعریف ان الفاظ میں کی جاتی۔ یار وہ بڑا پڑھا لکھا آدمی ہے، اسے اُردو زبان بالکل نہیں آتی۔ اعلیٰ سروسز تک رسائی، ترقی کے مواقع، سماجی حیثیت اور مرتبے، ایک ایسی زبان کے مرہون منت رہے جس سے اس ملک کی پچانوے فیصد آبادی قطعی طور پر نابلد اور ناآشنا تھی۔ ایک طویل عرصہ تک قوم کو طفل تسلیاں دی جاتی رہیں کہ اُردو کو جلد ہی اس کا جائز مقام دلایا جائے گا۔ ایک مدت تک اہل وطن اس پرفریب وعدۂ فردا پر اعتبار کرنے کے خوگر ہو گئے۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ دنیا کی کوئی قوم اپنی زبان کے بغیر ترقی کی منازل طے نہیں کر سکتی۔ اُردو زبان کو جسے ایک ارب سے زیادہ لوگ بولتے، پڑھتے، لکھتے یا سمجھتے ہیں محض اس لئے طاق نسیاں میں نہیں رکھا جا سکتا کہ اس کے اندر سائنسی علوم کو اپنے اندر جذب کرنے یا سمونے کی سکت نہیں ہے۔ اس مدقوق منطق کا اس وقت بھی سہارا لیا گیا جب لاطینی زبان میں لکھے گئے علوم کو انگریزی کے قالب میں ڈھالا جا رہا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اب بھی ستر فیصد علوم دیگر زبانوں میں ہیں۔ تو کیا یہ ضروری ہے کہ انگریزی کے ساتھ ساتھ روسی، چینی، جرمن، فرنچ، اطالوی اور ہسپانوی زبانوں کو بھی پڑھا جائے۔ جب ہم اُردو کی ترقی اور ترویج کی بات کرتے ہیں تو انگریزی کی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کرتے۔ کسی بھی زبان کا جاننا ایک احسن اور مفید بات ہے۔ اس سے فکر کو جلا ملتی ہے اور اذہان کے کئی بند در وا ہوتے ہیں۔ یہ زبانیں ضرور سیکھیں لیکن اُردو کی قیمت یا اس کی قربانی دے کر نہیں۔ پہلے اپنی قومی زبان سیکھیں اس

پر فخر کریں اس کے بعد جو زبان بھی سیکھیں گے وہ سونے پر سہاگہ ہوگی۔

اُردو کے پرستاروں اور دائیوں پر ہمیشہ طنز و تشنیع کے نشتر چلائے گئے ہیں۔ ان کا مذاق اُڑایا گیا ہے اور پھبتیاں کسی گئی ہیں۔ بسا اوقات مخالفت اور مخاصمت کے علاوہ ان کے خلاف انتقامی کارروائیاں بھی ہوئی ہیں۔ اس تناظر میں، سب کچھ جانتے ہوئے بھی ہم نے عالمی اُردو کانفرنس کا اہتمام کیا۔ سرکاری سطح پر ایسا کرنا ممکن نہ تھا۔ محکمہ فنانس ایک ٹکہ دینے پر بھی راضی نہ ہوتا۔ اس سے پہلے ایک نیم دلانہ کوشش ہوئی۔ محمد علی ایکٹر نے میاں نواز شریف کو بتایا کہ عالمی اُردو کانفرنس کرائیں۔ آپ کی مقبولیت کا گراف اُوپر چلا جائے گا۔ انہوں نے اصولی طور پر رضامندی ظاہر کی لیکن جب ایک کروڑ روپے کے اخراجات کا سنا تو ٹال گئے۔

ظاہر ہے ہمارے پاس اس قدر کثیر رقم نہ تھی لیکن جب دل میں کچھ کر گزرنے کا جذبہ ہو تو پھر قدرت بھی مدد کرتی ہے۔ بیوروکریسی کے علاوہ بھی مخالفین کی کمی نہ تھی۔ ہمارے کچھ مہربان سرائیکی بیلٹ میں اُردو کی ترقی کے خلاف تھے۔ پھر ہندوستان سے ہندو ادیب اور شاعر بلانا آسان کام نہ تھا۔ لوگوں کے مذہبی جذبات کو بھڑکایا جا سکتا تھا۔

بڑی سوچ بچار کے بعد ہم نے جو ائیگزیکٹو کمیٹی بنائی اس میں چیدہ چیدہ علما کو شامل کیا گیا۔ قاری محمد حنیف جالندھری، مولانا سلطان محمود ضیاء، وزیر غازی، اشتیاق حسین جعفری، مفتی عبدالاقوی، حامد سعید کاظمی، میئر ملتان اور چیئرمین ضلع کونسل بھی ممبر تھے۔

مخالفین کا پہلا وار ہی خالی گیا۔ جب وہ قاری حنیف جالندھری کو ملے اور ہندوؤں کا ہوا دکھایا تو وہ مسکرا کر بولے "بھائی ہم تو ان کے استقبال کرنے والوں میں شامل ہیں۔" دائیں کی منت سماجت بھی فضول تھی۔ کیونکہ وہ اردو میں سرياں بھیجنے کا حکم پہلے ہی صادر کر چکا تھا۔ مشاعرے کو کانفرنس کے ساتھ نتھی کرنے کا یہ فائدہ ہوا کہ حلقہ ارباب ذوق بھی متحرک ہو گیا۔

بڑی سوچ بچار کے بعد ہم نے ہندوستان سے صف اوّل کے اُردو دانوں کو مدعو کیا۔ گوپی چند نارنگ، جگن ناتھ آزاد، لکھنو یونیورسٹی کے ڈاکٹر خلیق انجم، کیف عظیم آبادی پٹنہ، ناروے سے جمشید مسرور، لندن سے اعجاز احمد اعجاز۔ ایران سے آقائے شاہ رُخ عرب شاہی اور چین سے یوان اے شوائے تشریف لائے۔ ملک کے نامور اُردو دانوں کو بھی مدعو کیا گیا جن میں قابل ذکر ڈاکٹر جمیل جالبی، احمد ندیم قاسمی، اشفاق احمد، ڈاکٹر سلیم اختر، عرش صدیقی، مولانا حامد سعید کاظمی، مشکور حسین یار، پروفیسر پریشان خٹک، جمیل الدین عالی، محمد صلاح الدین، مدیر اعلیٰ ہفت روزہ تکبیر، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن اور دیگران نے مقالے پڑھے۔ کانفرنس دو کی دو نشستیں ہوئیں۔ پہلی کی صدارت وزیر اعلیٰ غلام حیدر وائیں نے کی۔

میں نے خطبہ استقبالیہ میں چار چیزوں پر زور دیا:

ا۔ اُردو سے محبت اور اسے ہر سطح پر رائج کرنے کی کوشش۔

۲- ملک میں دُہرے نظام تعلیم کی حوصلہ شکنی۔ ایک ہی ذریعہ تعلیم و تدریس ہونا چاہئے۔
۳- اعلیٰ سروسز کے لئے امتحانات اُردو میں لئے جائیں۔
۴- پاکستان کے آئین میں اردو کے نفاذ کے لئے جو تاریخ مقرر ہے اس میں بار بار تبدیلی نہ کی جائے۔

آخر میں وائس صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''جناب والا! اس وزارت علیہ پر بھروسہ نہ کریں۔ یہ آنے جانے والی چیز ہے۔ آپ تاریخ کی دہلیز پر کھڑے ہیں اور تاریخ نے یہ دیکھنا ہے کہ آپ نے قومی زبان کی کیا خدمت کی ہے۔ تقریر ختم کرنے سے پہلے جب میں نے یہ شعر پڑھا:

حُسن والے حسن کا انجام دیکھ
ڈوبتے سورج کو وقت شام دیکھ

.....

تو کئی مضطرب نگاہیں بیک وقت اُٹھیں۔

گوپی چند نارنگ کے مقالے ''اُردو زبان بھارت کے تناظر میں'' کو بہت پسند کیا گیا۔ لوگوں کو پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ ایک ہندو اُردو کا کس قدر شیدائی ہے۔ انہوں نے کہا ''اُردو کا دامن طرح طرح کے پھولوں سے بھرا ہوا ہے۔ اس کی جادو اثری میں ''شکوہ ترکمانی، ذہن ہندی اور نطق اعرابی تینوں کا ہاتھ ہے۔ جب نئی تاریخی حقیقتیں اُبھرتی ہیں تو نئے سماجی تقاضے پیدا ہوتے ہیں اور نئی سچائیاں وجود میں آتی ہیں۔ اُردو ایسی ہی ایک سچائی ہے۔ لسانی سماجی اور تہذیبی سچائی جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے صدیوں کے رابطے اور اختلاط و ارتباط سے وجود میں آئی۔ اس وقت اس کا کوئی نام نہیں تھا۔ جب بھی کوئی سچائی جنم لیتی ہے اس کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ سچائیوں کو نام تو اس وقت ملتا ہے جب وہ خانہ زاد ہو جاتی ہیں۔''

پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے ہندوستان میں ''اقبالیات، آزادی'' کے بعد پر مقالہ پڑھا۔ ان کا پر مغز مقالہ سن کر احساس ہوا کہ ہمارے اقبال شناسوں کو ابھی مزید بہت کچھ سوچنا اور سمجھنا ہے۔

احمد ندیم قاسمی صاحب کا مضمون ''پاکستان میں نفاذ اُردو کا سلسلہ'' ایک طرح سے صدائے احتجاج تھی۔ انہوں نے بیوروکریسی پر سخت تنقید کی جو اپنی قومی زبان کو بیروں اور چوکیداروں کی زبان قرار دیتے ہیں اور اس کی راہ میں ہزار رکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں۔ انہوں نے ایسے لوگوں کو نفسیاتی مریض قرار دیا جو آزاد کہلانے کے باوصف ذہنی طور پر غلام ہیں۔ جب انہوں نے اپنا یہ شعر پڑھا تو بڑی داد ملی:

بے وقار آزادی، ہم غریب ملکوں کی
تاج سر پہ رکھا ہے، بیڑیاں ہیں پاؤں میں

ڈاکٹر جمیل جالبی کا مقالہ ''پاکستان کا دفتری نظام اور اُردو'' بھی اسی سلسلے کی کڑی تھا۔ ان کے خیال میں بیوروکریسی اپنا تسلط قائم رکھنے کے لئے قومی زبان کو پنپنے نہیں دیتی۔ جب تک انگریزی ذریعہ تعلیم رہے گا طلبہ میں تخلیقی قوتوں کو اُجاگر اور بیدار نہیں کیا جا سکتا۔ اس سلسلے میں انہوں نے یونیسکو کی رپورٹ کا بھی

حوالہ دیا۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے بھارت میں اُردو کی موجودہ صورت حال پر روشنی ڈالی اور اسے جس قسم کی مشکلات اور تعصبات کا سامنا ہے اس کا تفصیلاً ذکر کیا۔ اشفاق احمد نے ''اُردو میں سائنسی تعلیم'' پر خصوصی مقالہ اپنے خوبصورت انداز میں پڑھا۔ کہنے لگے ''آج سے چند سال قبل ساہیوال کے ڈپٹی کمشنر کو یہ سن کر بہت حیرت ہوئی کہ جرمنی میں سائنس جیسا اہم مضمون جرمن زبان میں پڑھایا جاتا ہے حالانکہ جرمن لوگ کافی دلیر اور ذہین ہوتے ہیں۔ ان کے نائب تحصیلدار نے اس کوتاہی کی بڑی ادب سے وضاحت کی تھی کہ سرکار اسی وجہ سے تو جرمنی جنگ ہار گیا۔ اگر اس نے سائنس کا علم سائنس کی اصل زبان انگریزی میں پڑھا ہوتا تو کبھی شکست نہ کھاتا اور اس وقت ساری دنیا پر راج کر رہا ہوتا۔''

بتانے لگے ''وہ کوپن ہیگن گئے تو اُن کی یتیم بانو قدسیہ کو ڈینش چیز بہت پسند آئی اور وہ بڑے شوق سے سات دن تک مختلف اقسام کی پنیر کھاتی رہیں۔ آٹھویں دن جب فیکٹری دیکھی تو وہاں پر ہر تحریر اور گفتگو ڈینش زبان میں ہو رہی تھی۔ انہیں یہ جان کر مایوسی ہوئی کہ وہاں انگریزی زبان کا داخلہ مکمل طور پر بند تھا۔ کہنے لگیں ''جبھی تو مجھے پنیر سے کھٹی کھٹی بو آ رہی تھی۔''

پروفیسر پریشان خٹک نے کہا کہ میرا ایمان ہے کہ اگر ہم اُردو کی مسلمہ حیثیت کو پس پشت ڈالتے ہوئے کوئی اور راستہ اختیار کرنے کا خیال بھی دل میں لائیں تو یہ اقوام پاکستان کی یک جہتی، یگانگت اور علاقائی تعلقات کے خلاف ایک سازش کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوگا۔ صرف اسی طرح مقصد تشکیل پاکستان اور ملکی تعمیر و ترقی کا جذبہ اپنی تمام تر توانائیوں کے ساتھ اُجاگر کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے اُردو کی ترقی میں علمی و ادبی اداروں کے کردار پر روشنی ڈالی۔

اس کے علاوہ بھی کافی مقالات پڑھے گئے۔ وزیر اعلیٰ کی تقریر کئی اعتبار سے اہم تھی۔ انہوں نے اپنی ان کوششوں اور کاوشوں کا ذکر کیا جو اُردو کی ترقی کے لئے کر رہے تھے۔ انگریزی زدہ سیکرٹریوں سے اُردو میں سمریاں بھجوانا بذات خود بہت بڑا کارنامہ تھا۔ کہنے لگے ''اکثر افسر طعنہ دیتے ہیں کہ وزیر اعلیٰ کو انگریزی نہیں آتی۔ اگر انگریزی ہی سب کچھ ہوتی تو میں وزیر اعلیٰ نہ ہوتا ان میں سے کوئی اس منصب کو سنبھالتا۔ احساس کمتری کا شکار وہ لوگ نہیں جنہیں انگریزی نہیں آتی بلکہ یہ انگریزی دان ہیں جو باہر جا کر کچھ اس قسم کا رویہ اختیار کرتے ہیں جیسے انہوں نے وطن میں پیدا ہو کر بہت بڑی غلطی کی ہو۔ انہوں نے قوم کو یقین دلایا کہ وہ آخری سانس تک قومی زبان کی خدمت کرتے رہیں گے۔ تقریر کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ انہوں نے نواب زادہ صاحب کے سارے گلے شکوے دور کر دیئے تھے۔ شعر نہ صرف بروزن تھے بلکہ حسب حال بھی تھے۔

رہے شوق ضبط شوق میں دن رات کشمکش
دل مجھ کو، میں ہوں دل کو پشیماں کیے ہوئے

کانفرنس کے اختتام پر کچھ قراردادیں اتفاق رائے سے منظور کی گئیں۔

[جاری ہے۔]

چھوٹا کون؟

میں ستاسی سال کا بوڑھا کہانی کار کچھ لکھنے پڑھنے سے جب فارغ ہوتا تو صبح تقریباً دس بجے دن سے بارہ بجے دن تک اندر کی بہ جائے بیٹھک کے بیرونی چبوترے پر بیٹھ کر صحن میں لگے نیم کے پیڑ کے کھنکنے پتوں میں موجود پرندوں کے سریلے گیت سنتا رہتا۔ اور پھر بارہ بجے سے دو بجے دوپہر تک بیٹھک میں رہ کر اپنا وقت گزارتا۔ بیٹھک کا بیرونی دروازہ چونکہ میں کھلا رکھتا تا کہ سامنے والی مصروف سڑک پر آنے جانے والوں کے چہروں کی جھلک سے لطف اندوز ہوتا رہوں۔ اس عمل سے مجھے بہت تسکین حاصل ہوتی۔ دو بجے دوپہر کا کھانا کھا کر تین ساڑھے تین بجے چار بجے تک بستر پر لیٹ کر نیند کے مزے لیتا پھر نیند سے بیدار ہوتا تو پھر چار کرسیاں ایک ایک کر کے اٹھا کر سامنے والے بے آباد گھر کی چوکھٹ کے بیرون پر ڈالتا جاتا اور پھر میں ان میں سے ایک پر بیٹھ کر اپنے جیسے بوڑھوں کا انتظار شروع کر دیتا، جو چند لمحوں بعد آ کر ان تینوں کرسیوں کو سنبھال لیتے پھر میں ان سے گپ شپ میں مشغول ہو جاتا۔ میرا اندر بھی میرے ان ہم عمر لوگوں جیسا ہی ہو جاتا کبھی کبھار جب وہ ہنسی مذاق پر اتر آتے تب میں اپنی کہانی کاری کے فن کو پس پشت ڈال کر ان میں شریک ہو جاتا اور پھر خوب کھل کر باتیں ہوتیں۔ جب کبھی وہ لوگ تشریف نہ لاتے تو پھر میں خالی کرسیوں کے لیے ادھر ادھر کھڑے چند گپیں ہانکتے جوانوں کو بلا لیتا۔ یوں جب وہ گھبرو اپنی اپنی کرسیوں پر براجمان ہو جاتے تو پھر میں خود کو ان کی عمروں کے مطابق ڈھال کر ان سے محوِ گفتگو ہو جاتا تو وہ اس گفتگو سے پورا حظ اٹھاتے اور بعض اوقات وہ حظ ان کے چہروں پر بشاشت سے بھری روشنی بکھیر دیتا۔ لیکن جب میں ان پر پند و نصائح کے ڈونگرے برسانے لگتا تو وہ فوراً اٹھتے اور یہ کہہ کر

''اچھا بزرگو اب ہم چلتے ہیں پھر کبھی آئیں گے آپ سے خوب باتیں ہونگی'' چلے جاتے، روانہ ہونے سے بیشتر ان کے چہروں پر کچھ ناگواری کے تاثرات بھی بہ خوبی دیکھے جا سکتے تھے۔ جن سے ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ میری ناصحانہ گفتگو سے نالاں تھے۔

ایک روز سردیوں کے ایام میں مَیں اُسی بے آباد گھر کے سامنے والی جگہ پر تنہا اپنی کرسی پر بیٹھا، سامنے پڑی ہوئی خالی کرسیوں سے مایوس ہو کر کوئی کہانی لکھنے میں مصروف ہو گیا لیکن چند لمحوں کے بعد کہانی

حنیف باوا

کو ادھورا چھوڑ کر میں سوچ میں پڑ گیا کہ آج وہ لوگ کیوں نہیں آئے جن کے بغیر یہ خالی کرسیاں آج کچھ بے وقعت سی لگنے لگی تھیں لیکن اس کے چند منٹ کے بعد ہی کچھ گھبرو آئے اور آتے ہی ان کرسیوں پر قبضہ جما کر بیٹھ رہے لیکن بیٹھنے سے پہلے انھوں نے ان کرسیوں کے رخ میری طرف سے موڑ کر اپنی طرف کر لیے۔ پھر وہ ایسی گفتگو میں محو ہو گئے جو ایسے نوجوانوں کا شیوہ ہوتا ہے۔ اس لیے دورانِ گفتگو وہ ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر خوب ہنستے اور اسی ہنسی کے دوران جب کوئی اچھا سا چٹکلہ پھوٹ پڑتا تو وہ اس قدر بلند قہقہے لگاتے جن سے سارا ماحول زعفران زار بن جاتا۔ کبھی کبھار وہ اس گفتگو کے بیچ سنجیدہ بھی ہو جاتے لیکن یہ سنجیدگی ان کے درمیان زیادہ دیر تک زندہ نہ رہتی اور وہ پھر سے اپنی سابقہ روش پر اتر آتے۔ لیکن اس ساری گفتگو کے دوران انھوں نے میری طرف ایک بار بھی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا اور میں نے بھی ان کی باتوں میں مخل ہونا نامناسب سمجھا بس خاموشی سے ان کی طرف دیکھتا رہا جو اس وقت مجھے بہت اچھے لگ رہے تھے۔

ابھی ان کی باتوں سے پھوٹتی پھلجھڑیاں جاری تھیں کہ اتنے میں میرے چچازاد بھائی رفیق کا چھوٹا بیٹا جو ابھی ابھی پولیس میں بھرتی ہوا تھا اچانک نمودار ہوا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اُن کی طرف بڑھا۔ اسے دیکھ کر جب وہ کھڑے ہوئے تو وہ ایک ایک کے ساتھ بغل گیر ہوا۔ کیا وہ چھٹی پر تھا اس کا مجھے قطعاً کوئی علم نہیں تھا۔ جب وہ اپنے دوستوں کے ساتھ ہاتھ ملا رہا تھا تو اس دوران اس نے ایک اچٹتی ہوئی نظر مجھ پر ڈالی اور پھر وہ اپنے ان یاروں کے ساتھ محوِ گفتگو ہو گیا۔ کچھ دیر ان سے باتیں کرنے کے بعد وہ اٹھا اور اپنے گھر چلا گیا جو میرے مکان سے کچھ زیادہ دور نہیں تھا۔

دوسرے روز میں ہر روز کی طرح شام کے وقت اسی خالی جگہ پر بیٹھا تھا جہاں پر میں نت بیٹھا کرتا تھا۔ کرسیاں گزشتہ روز کی طرح خالی پڑی تھیں۔ آج نہ جانے کیوں ان کا خالی پن مجھے کھٹک رہا تھا اور میں ان کی طرف دھیان دیے بغیر سامنے تکے جا رہا تھا کہ اچانک میرا وہی پُرسا بھتیجا گھر سے نکلا اور ہولے ہولے قدم اٹھاتا ہوا میری طرف آ کر رک گیا۔ آنے کے بعد پہلے اس نے میرے ساتھ سلام دعا کی پھر ہاتھ ملانے کے بعد مجھ سے کہنے لگا:

"تایا جی کل آپ مجھ سے ملے ہی نہیں میں چھٹی پر آیا ہوا ہوں۔ حالانکہ میں آپ کے قریب ہی تو بیٹھا تھا دوستوں کے ساتھ گپ شپ لڑانے کے لیے آپ اٹھے ہی نہیں پتا نہیں کیوں؟" لیکن میری طرف سے جب اس کے سوال کا کوئی جواب نہ بن پایا تو وہ وہاں سے کھسک گیا۔ اس کے جانے کے بعد بڑی دیر تک میں اس کے سوال پر غور کرتا رہا تو پھر بڑی مشکل سے میرے منھ سے نکلا:

"ابے او بوڑھے کہانی کار کل کھڑے ہو کر اس سے تم مل لیتے تو کیا حرج تھا۔"

میں یہ کچھ اگلنے کے بعد میں کافی دیر تک نظریں نیچی کیے بیٹھا رہا۔

☆☆☆☆☆

ہم کہ ٹھہرے اجنبی.....

میں 75 برس پہلے امرتسر سے لاہور کے لیے روانہ ہوئی تھی اور اب تک لاہور نہیں پہنچی ہوں- اس مسافت نے مجھے کئی پڑاؤ بھی دیئے، مگر میں کہیں نہیں رکی.. رکتی بھی تو کہاں، کہیں ٹھکانہ نہیں تھا..... چھاؤں ڈھونڈنے میں اس قدر تھکی کہ سردیوں کی دھوپ بھی نہ تاپ سکی اور جاڑے کے موسموں میں چرمراتی رہی.. جوانی کا وقت تھا جب سرحد پار کر آئی تھی.. گود میں ایک بچہ تھا جس کے باپ کو ایک کرپان چاٹ گئی تھی.. اس وقت تک میں قافلے سے جڑی تھی اور متحد ہونے کی وجہ سے بچ گئی تھی.....

میں کتابوں اور کاغذوں کی خوشبو سے بہت دور تھی مجھے بس اتنا بتایا گیا تھا کہ نظریے میں سبز اور جھنڈے میں سفید رنگ کوئی معنی رکھتا ہے- یہ دو رنگ امن اور خوشحالی اور رواداری کی علامت ہوتے ہیں..... میں ان دو رنگوں کا پرچم ہاتھ میں لے کر زندگی بھر چلتی رہی تھی..... مجھے جھنڈے پر اعتبار تھا، لیکن یہ بھول گئی تھی کہ جھنڈا تو بے جان چیز ہے، اعتبار کا ہنر تو جھنڈا تھامنے والوں میں ہونا چاہیے..... میں دیکھتی رہی کہ جھنڈا خاص دنوں اور خاص عمارتوں پر خاص لوگ ہی لہراتے تھے، عام لوگ البتہ سینے پر سجائے رکھتے تھے وگرنہ ان پرچم بنی جھنڈیوں کو خاکروب جھاڑو سے اکٹھا کر کے کوڑے دان میں بھر رہا ہوتا تھا..... مجھے زندگی بھر کوئی گھر نہیں ملا- ہجرت نے مجھے صرف جدائی دی تھی اس ہجر نے میری کمر توڑ دی تھی ..... میں مزدور بن چکی تھی اور مملکت خداداد کے لیے ایک نیا مزدور اپنے بیٹے کی شکل میں تیار کر رہی تھی- شاید تعمیر ہماری عادت میں ہے- میں نے اپنی مسافرت کے مختلف پڑاؤ میں جمہور کو قومی لیڈر منتخب کرتے ہوئے اتنی بار دیکھا کہ یہ بچوں کا کھیل لگنے لگتا، ہر بار غلط انتخاب ہو جاتا اور قوم دوبارہ غلطی سدھارنے میں لگ جاتی، اس نے بار بار اتنی زیادہ غلطیاں کیں کہ وردیوں والے سرحدوں پر اپنا کام چھوڑ

فرخندہ شمیم

کر شہروں کے دفتروں میں آن گھسے اور جمہور کا نظام چلانے کی ضد کرنے لگے، تھوڑا تھوڑا کھا کر اور زیادہ سے زیادہ چرنے کے بعد جب یہ کندھے والے ستارے واپس بیرکوں میں گئے تو پیچھے بوری بند بچے چھوڑ گئے۔

میں نے یہ سب دیکھ کر اپنے مزدور بیٹے کو جلدی سے مٹی کے طویلے میں چھپا دیا تھا۔

اس مملکت خداداد میں میرا نام ہر پانچ سال بعد ووٹر لسٹ پر چمکتا تھا ورنہ آسمان پر قطبی ستارے کی طرح گمنام ہی رہتا تھا، میں نے اپنا نام مہاجروں اور ووٹروں کی لسٹ کے علاوہ کسی اور فہرست میں کبھی نہیں دیکھا۔ نہ کھانا ملنے والوں کی فہرست میں اور نہ گھر پانے والوں کی فہرست میں مجھے نعرے لگانے والے اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ اچھی خوراک اور ٹھنڈی بوتلیں دیا کرتے اور میں اور میرا بیٹا لیڈروں کی ہر بات پر تالیاں بجا بجا کر اپنی ہتھیلیاں سرخ کر لیا کرتے تھے۔ میں اب اکثر کچھ انوکھے لفظ سننے لگی تھی لیکن مجھے ان کا مطلب معلوم نہیں تھا۔

مجھ ان پڑھ کو کیا خبر تھی کہ این آر او، ٹین پرسنٹ اور ایک پیج پروغیرہ کیا ہوتا ہے..... لوگوں نے میرا مذاق اڑایا اور کہا یہ جدید پروجیکٹ ہیں کیا تمہیں نہیں پتہ؟

مجھے کیا پتہ مجھے تو صرف نظریے کا پتہ ہے، جس نے مجھے آزادی دلائی ہے لوگ ہنس پڑے، کراچی جا کر مزار قائد پر میری کم علمی کی شکایت کر دی۔

میں نے سنا ہے کہ شکایت کرنے والوں کو قائد نے ایک گھونسا رسید کیا تھا..... میں خوش ہو گئی تھی، لیکن دریا کے کیچڑ کنارے ابھی تک بدبودار تھے مملکت خداداد میں زبانوں کی لڑائی شروع ہو چکی تھی۔

میری زبان سرحد پار کی تھی اسے مسترد کر دیا گیا، اس زبان کے بولنے والے بے روزگار اور بے آسرا کر دیے گئے..... طاقتوروں کو یہ ڈر بھی نہیں ہوا کہ اس طرح تو ان کے ووٹ کم ہو جائیں گے، لیکن تعجب ہے میں نے اکثر دیکھا ہے اسمبلیوں میں ایسے لوگوں کے نمبر جانے کہاں سے پورے ہو جاتے ہیں؟

ایک دن اچانک میرا مزدور بیٹا کہیں گما دیا گیا، میرا دم نکل گیا ڈھونڈ ڈھونڈ کر بے دم ہو گئی.. آنکھیں پتھرا گئیں میری ایک صبح وہ مجھے جھونپڑی کے باہر بوری بند ملا۔ میری پتلیاں لرز کر رک گئیں، بوڑھے ہاتھوں نے کانپتی پلکوں سے بوری اٹھالی۔ دفنانے کے لئے لیکن مجھے ابھی تک قبرستان نہیں ملا ہے۔

میں 76 برس بعد بھی سرحد پار سے لاہور نہیں پہنچ سکی ہوں اور اب تو عمر کے ساتھ ساتھ میری یادداشت بھی بہت کمزور ہو گئی ہے، مگر نجانے کیوں ایک نکتہ بار بار مجھے یاد رہتا ہے۔ میری ماں نے ایک بار وطن کا جھنڈا سیتے ہوئے مجھے کہا تھا

''جھنڈے کے رنگوں سے امید لیتی رہنا''

☆☆☆☆☆

محبت کُل ہے

تہی دست اور تہی دامن نظر آنے والا ضروری نہیں کہ تہی ہی ہو۔ آنکھ سے دیکھا اور کان سے سنا بھی جھوٹ ہوسکتا ہے۔ عمر کا ایک تہائی گزار کر گلی کے تھڑے پہ اداس بیٹھے شخص کو تہی دامن نہ سمجھو۔ یہ سمجھنا بھی غلط فہمی ہوسکتی ہے کہ اس کا معاشرے میں مقام یہی ہے جو نظر آرہا ہے نہیں یہ ضروری نہیں --- ہوسکتا ہے وہ اپنی یاد سے منسلک کسی گلی میں آ نکلا ہو اور خود کو یاد کے سپرد کر کے بیٹھ گیا ہو--- دانستہ---

کبھی کبھی اس کی آنکھوں میں نشہ سا ہلکورے لیتا ہے۔ لال ڈورے تن جاتے ہیں۔ یہ خمار کسی سہانی یاد کا ہے جو اسے نگونک بھر دیتا ہے تو وہ شانت ہوجاتا ہے۔ درد بھرے ان خالی دنوں کا ملال زائل ہوجاتا ہے۔ شام ڈھلے تھڑے سے اٹھ کر گھر جاتے سمے وہ ویسا اداس نہیں رہتا، یاد کی چنچل پائل نے اس کے اندر خوب رونق لگادی ہے۔ اب کچھ دن تو وہ اسی تال پہ محو رقص رہے گا۔ اپنے آپ سے اور اپنے ماحول کی تلخی سے دور، صرف اس یاد کی یاد میں گم۔ یاد ساون رت کی طرح گرد و نواح کو جل تھل کر دیتی ہے۔ ایک دم ٹھنڈا ٹھار ------ یاد میں ایک مانوس سی خوشبو تھی جس نے اس کے پورے وجود کو لپیٹا مار لیا تھا۔ اس تعفن زدہ گرد و پیش سے اچک لیا تھا۔

جمال ترمذی ہمہ وقت محبت کے احساس میں گھرا رہتا اور ہزار بار شکر کرتا کہ یہ قیمتی احساس تو اس کے پاس ہے ورنہ زندگی میں کیا ہوتا-- کچھ بھی تو نہیں۔

وہ آئینے میں خود کو دیکھ کر مونچھیں درست کرنے لگا۔ تبھی کوئی اور چہرہ بھی آئینے میں ابھر آیا۔

''ہم سے زیادہ عقلمند تو ہمارے بچے ہیں جمال---- زمانہ شناس زندگی کے فلسفے کو چند ہی سالوں میں سمجھ گئے، ایک ہم ہیں جو سمجھ ہی نہیں سکے کہ زندگی آگے کی طرف بڑھتی ہے۔ اور رررماں باپ کو بچوں کے احساسات کا ان کے معاشرے میں مقام کا خیال رکھنا چاہیے جبکہ---- بچوں کو اپنی زندگی میں آنے والے جیون ساتھی ---- جو ابھی ابھی ان کی زندگی میں آیا اس کا خیال رکھنا چاہیے نہ کہ والدین کا--''

وہ ہتھیلیوں سے گالوں پہ پھسلتے آنسو صاف کرتی جاتی آنسو پھر بھگوتے جاتے۔

''تو ہمارا خیال کون رکھے گا--- میرا خیال؟ تم تو مرد ہو ناں تمہارا تو ہر حکم مانیں گے تمہارے بیوی بچے ----- لیکن میں'' ایک سسکی سارے ماحول میں سرایت کرنے لگی۔ تو جمال نے اس کے کانپتے ہاتھ اپنے گرم ہاتھوں میں لے لیے۔

''میں رکھتا تو ہوں تمہارا خیال، ہر وقت --- ہر لحہ'' وہ اپنے ہاتھ چھڑا کر ذرا سی دور کھسکی

''تم میرے خیال سے اپنے آپ کو خوش رکھتے

ثمینہ سیّد

ہو اور مجھے بھی اس سے کسی قدر خوشی ملتی ہے لیکن میں "اس خیال" کی بات نہیں کر رہی جمال۔"
وہ جانتا تھا وہ کس خیال کی بات کر رہی ہے لیکن انجان بننا اس کی بھی مجبوری تھی۔ کیسے کہہ دیتا کہ میں ہر وقت تمہارے ساتھ ہوں۔ ہر طرح کے حالات میں، کیسے کہہ دیتا کہ میں تمہیں دنیا سے چرا کر اپنے دل کے نہاں خانوں میں چھپا لینا چاہتا ہوں --- جہاں اس دنیا کی روک ٹوک، رسم و رواج، اصول قائدے نہ ہوں--- بس تم میری پناہ میں رہو -- اور کوئی تمہیں دکھ نہ دے --- تمہارے اپنے بھی نہیں، میں کسی کو بھی تم تک رسائی نہیں دینا چاہتا--- کیونکہ تم نے مجھے وہ محبت دی ہے جس نے مجھے سیر کر دیا ہے--- تم میری طلب کی تشفی ہو-- لیکن بولا تو صرف اتنا

"تمہیں میری محبت کافی نہیں لگتی یار؟ میں صرف تمہیں سوچتا ہوں، صرف تمہیں چاہتا ہوں--- اور یہ سارے حالات تو ایسے ہی تھے جب ہم ملے تھے، ہم ان سارے رشتوں کی بندش میں تھے پہلے سے--- تمہیں بھی سب پتہ تھا ناں، میں نے تمہیں کوئی دھوکا تو نہیں دیا---"

جمال نے یہ جملے سو سے زیادہ بار بولے ہوں گے اور فرحین نے اس سے دُگنی بار سنے تھے کیونکہ وہ اس کی ہر بات کی بازگشت میں جیتی تھی۔ پہلے پہل تو کہتی بھی تھی

"زندگی کی ترتیب میں اگر ہم مل ہی گئے تو تم مجھے اپنی زندگی میں شامل کر لو، بہت سے لوگ ایسا بھی تو کرتے ہیں کوئی قیامت نہیں ٹوٹتی---"

اس پر جمال اس کے اور قریب ہو جاتا۔

"یقین کرو میاں بیوی کا رشتہ بہت ہی فضول ہے، ساری محبت-- سارا لحاظ ختم ہو جاتا ہے۔ ایسی لطافت ایسی کشش نہیں رہتی۔ جیسی ہم اتنے سالوں بعد بھی محسوس کر رہے ہیں --- ایسے جیسے پہلی بار مل رہے ہوں، دھڑکن سنو اور کہو--- میں جھوٹ کہہ رہا ہوں؟--- کہتے ہیں کچی عمر کی محبت ہمیشہ لو دیتی ہے لیکن یہ--- اس عمر کی محبت تو--------- دلی اور ذہنی سکون ہے۔"

وہ سر جھکا لیتی --- آنکھیں بھر آتیں، بے بسی کی شدت سے اٹھ کر ٹہلنے لگتی۔ اور پھر بات بدل جاتی۔

جمال کا چہرہ اشکوں سے تر ہو گیا اس نے اپنے وجود کو آئینے میں ڈوبتے دیکھا۔ لیکن اسی پل اپنی بیٹی کی آواز پر اسے ابھرنا پڑا اس نے بساط سمیٹی اور کمرے سے نکل آیا۔

"کبھی کبھی ہم شعروں کا سہارا لے کر اپنی داستانِ دل بیان کرتے ہیں اور کبھی کبھی ہمارا اپنا ہی کوئی شعر ہماری نئی تشکیل، نیا جنم کر دیتا ہے ہم اس کی کیفیت میں ڈھل جاتے ہیں۔ شعر ہمیں اگل دیتا ہے--- بس اتنی سی ہماری اوقات ہے، ہم لفظوں کے کھلاڑی اپنے ہی لفظوں سے مات کھا جاتے ہیں۔"

فرحین آغا نے یہ سب کہتے ہوئے اپنے لہجے کو بمشکل ہموار کیا۔ آنسوؤں کی نمی اب اس کی راہ میں حائل نہیں ہوتی تھی۔ انٹرویو کرنے والی لڑکی نے شوخ لہجے میں پوچھا۔

"آپ کیا سمجھتی ہیں محبت ہی ہے جو کسی بھی عام انسان کو خاص بنا دیتی ہے اور وہ شعر

کہنے لگتا ہے، کہانیاں لکھنے لگتا ہے۔؟"
فرحین نے کچھ پل سوچا، حسبِ عادت لمبی سانس کھینچی جس میں وہ ساری توڑ پھوڑ اپنے اندر اتار لیتی تھی۔
"جی ایسا ہی ہے --- محبت بہت منہ زور ہوتی ہے اور فطری بھی، وحی کی صورت در دل پر اترتی ہے، بغیر اجازت ہماری پوری ہستی کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ اس کے اترنے کا کوئی وقت یا عمر بھی مقرر نہیں --- ہاں خاص بھی بنا دیتی ہے، ہم خود ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کرتے ہیں اپنے آپ کو --- لیکن جتنی بھی طاقتور ہو ----- ہار جاتی ہے۔

آپ ملتے یا پھر جدا ہوتے
مجھے دونوں طرح خسارا تھا

.....

"فرحین نے مسکرا کر شعر پڑھا
"آپ کا مطلب ہے کہ مر جاتی ہے اور کیا آپ سمجھتی ہیں کہ محبت بار بار ہوتی ہے؟
"سوال پوچھ کر لڑکی فرحین آغا کو غور سے دیکھنے لگی --- کیمرے نے فرحین کی آنکھ کے کونے پر رکا اشک دکھایا، وہ سنبھلی پھر بولی
"نہیں محبت کبھی مرتی نہیں --- میرے مطابق تو بار بار بھی ان کو ہوتی ہے جو محبت کے ساگر میں پوری طرح نہیں بھیگتے جو سیر چشم نہیں ہوتے۔ یا پھر جو اپنی محبت کو اپنے اندر مرنے دیتے ہیں، دفن کر کے آگے بڑھتے ہوں گے --- یقیناً ---- میرے ساتھ ایسا نہیں ہے۔ محبت لافانی جذبہ ہے --- شکر گزار ہوں کہ محبت شناس ہوں، میرے خیال میں اگر محبت ہارتی ہے تو صرف رشتوں کے ہاتھوں ہارتی ہے۔ رشتے محبت کے سچے جذبے سے بھی زیادہ توانائی رکھتے ہیں --- ہر چیز کو مات دے دیتے ہیں --- ہم رشتوں کو محبت کا فلسفہ سمجھا سمجھا کے تھک جاتے ہیں تو ان کے آگے ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ ان کی مان لیتے ہیں --- چلو بہت لمبا انٹرویو ہو گیا۔ میرا پیغام محبت ہی ہے تمہارے قارئین، سامعین اور ناظرین کے لیے --- اب سمیٹو یہ بساط۔"
فرحین نے اپنی ازلی مسکراہٹ کو چہرے پر سجایا۔
پھر کیمرے نے دکھایا۔
فرحین آغا نے اپنے بچوں کو بلا لیا ان کے ساتھ چند تصویریں بنوائیں، انٹرویو ٹیم کو کھانا کھلایا اور کیمرہ کلوز ہو گیا۔
جمال ترمذی نے فرحین کا پورا انٹرویو سنا اور اسے بغور دیکھا، دل میں اتارا۔ کتنی مدت بعد وہ اسے دیکھ رہا تھا کبھی جسے دیکھے اور سنے بغیر شام ہی نہیں ڈھلتی تھی۔
وہ دل سے اس عورت کے حرف حرف کا معترف تھا اور محرم بھی --- اپنے ادھورے وجود کے ساتھ وہ بھی تو یہی کرتا پھر رہا تھا۔ بہت بڑا آدمی، اپنے بیوی بچے، اپنی دنیا کی گہما گہمی، بس مکمل ہونے کا ڈھونگ اور ایک یاد ----- یہی تو کل تھا ----- محبت کل ہے --- انسان تو بس جزوِ محض ہے۔ محبت کے سمندر کا ایک ذرہ۔
اپنی سانسوں کو توازن میں چلانے کے لیے ایک بے نام تعلق بھی بہت ہوتا ہے۔

☆☆☆☆☆

اے عشقِ جنوں پیشہ

ایک دفعہ کا ذکر ہے بلکہ دو دفعہ کا ذکر ہے یا شاید تین دفعہ کا ذکر ہے۔ گورگانی نے میری کمر پر ایک دھول جماتے ہوئے کہا بکواس ہی کیے جاؤ گے یا آگے بھی کچھ کہو گے۔ آگے آگے کیا کہوں جب کہنے کو کچھ نہیں اور اب تو یوں لگتا ہے کہانی ختم ہوگئی۔

76 سال سے یہی سنتے آرہے ہیں ملک اپنے نازک ور سے گزر رہا ہے۔ جہاں ہم صدیوں سے رہ رہے تھے اپنی شناخت کے ساتھ یہاں گویا اُسی ملک کے حصے میں، جسے پاسپورٹ دے کر ایک نیا نام دیدیا گیا۔ اُسی ملک کے لوگوں پر اُسی ملک کے صدیوں سے ایک ساتھ رہنے والوں نے مذہب کے نام پر جو کچھ کیا۔ کرشن چندر کی ''پشاور ایکسپریس'' میرے تصور میں چھک چھک کرتی گزر گئی۔

گورگانی نے ایک لمبی ہوں کہی پھر کچھ دیر بعد بولا__ یار آؤ یہاں سے بھاگ چلیں۔ میں نے کہا کیا ''پاکستان سے زندہ بھاگ'' کا بھوت تم پر تو سوار نہیں ہو گیا۔ بھاگ چلیں تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے یہ کوئی آسان کام ہے۔ یارا آسان کام تو واقعی نہیں ہے۔ تمھارے لیے تو پھر بھی آسان ہے کہ تم تعلیم یافتہ ہو۔ میں تو پیدائش سے اب تک تعلیمی لحاظ سے بھی کنوارہ ہوں۔

گورگانی یار یہ تو ایسے ایسے حیران کن جملے کہاں سے گھڑ لیتا ہے۔ گورگانی نے میری بات سُنی ان سُنی کرتے ہوئے کہا۔

بھائی ہم دونوں کی شادی نہیں ہوئی۔ یہی وہ وقت ہے جب ہم یہاں سے بھاگ سکتے ہیں اُس نے لفظ بھاگ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

گورگانی کو میں کئی برسوں سے جانتا ہوں۔ ہُوا یوں کہ میرے گھر کے برابر والے ایک کنال کے پلاٹ پر کسی نے ایک شاندار گھر بنایا۔ پھر سُنا منتقل ہونے سے ایک دِن پہلے اُن کا انتقال ہو گیا اور گھر کو منحوس سمجھتے ہوئے اُس پر قابلِ فروخت کا بورڈ لگ گیا۔ پھر سُنا ایک امیر دیہاتی نے وہ مکان خرید لیا اور یوں گورگانی میرا ہمسایہ بنا اور یہ ہمسائیگی دوستی میں بدل گئی۔

اچھا وہ تو سب ٹھیک ہے کہ امریکہ چلے جائیں گے یا بقول تمھارے بھاگ جائیں گے مگر ویزا کیسے لے پائیں گے۔ نائن الیون کے

اقبال خان یوسف زئی

واقعہ کے بعد تو امریکہ کا ویزا بہت ہی مشکل بن گیا ہے۔ بعض لوگ نائن الیون کے المناک حادثے کو چھوٹے کا بڑے کے منہ پر طمانچہ سے منسوب کرتے ہیں" مگر اُس وقت وہ کہاں تھے جب انگریزوں نے کالی کٹ کے بحری راستے سے داخل ہوکر پورے بھارت پر قبضہ کرلیا تھا۔ دنیا کی تاریخ گواہ ہے طاقت کبھی طشت میں رکھ کر پیش نہیں کی جاتی۔" میں نے گورگانی کی طرف دیکھا اُس نے پھر ایک دفعہ مجھے حیران کردیا۔

بہرحال طے یہ ہوا کہ ہم دونوں کولمبس کا امریکہ دیکھنے جائیں گے اور ضرور جائیں گے بعض لوگ دور کی کوڑی لاتے ہیں اور نائن الیون کو امریکہ کا ہی "کارنامہ" بتاتے اور سمجھاتے ہیں۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ تو اپنے ایک شہری ریمنڈ ڈیوس کو خطرے میں دیکھ کر اُسے کیسے یہاں سے نکال کر لے گئے کہ عقل اپنا سر پیٹ لیتی ہے اور حیرانی ناطقہ سر بہ گریباں بن کے رہ جاتی ہے۔

یہ کہہ کر تو گورگانی نے مجھے حیران کردیا کہ میں نے دل ہی دل میں سوچا یہ آدمی آخر کتنی سوجھ بوجھ رکھتا ہے۔ گورگانی نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ جب 1747 کو نادر شاہ نے ایران سے آکر ہندوستان پر حملہ کیا اور دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ اپنے ایک سپاہی کے دہلی میں قتل کیے جانے پر حشر بپا کر دیا حکم دیا کہ دہلی کے ہر فرد کو قتل کر دو 5 گھنٹوں میں تین لاکھ آدمی قتل کر دیئے گئے۔ اتنا خون بہا کہ دہلی کی نالیاں خون سے سرخ ہوگئیں۔ مرنے والوں کی کھوپڑیاں بھی گلیوں سے گزرنے والوں کی ٹھوکروں میں آگئیں:

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آگیا
یکسر وہ استخوان شکستہ سے چُور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر
میں بھی کبھو کسو کا سرِ پُرغرور تھا

.....

لوگ عزیز و اقارب ہماری دوستی کی مثالیں دیتے تھے جب سے میری گورگانی سے دوستی ہوئی کوئی ایک بھی دن ایسا نہیں جب ہم ایک دوسرے سے نہ ملیں ہوں۔ اخلاص اور محبت کا دوسرا نام گورگانی تھا۔ اُس کی معلومات اور یادداشت پر کبھی کبھی تو میں خود کو چغد سمجھتا۔ بس کبھی کبھار میرے منہ سے کوئی انگریزی زبان کا لفظ نکل جاتا تو وہ احمقوں کی طرح پوچھتا میں سمجھ تو گیا ہوں مگر اب اس کا مطلب بھی بتا دو۔ اُس میں بس یہی ایک کمزوری تھی۔ ورنہ کیا گھوڑی سواری کیا بندوق پستول کا نشانہ مجال ہے کہ نشانہ چُوک جائے۔

ایک دن ہم نے گھوڑ دوڑ کے مقابلے میں حصہ لیا۔ اُس کے گھوڑے کا اگلا پاؤں میرے گھوڑے کے قدم سے ذرا سا آگے تھا۔ اُس کا اصرار تھا کہ اوّل قرار دیا جاؤں مگر منتظمین اُس سے متفق نہ ہوئے۔ میں نے اُس سے کہا میں تو خود کو بڑا شہسوار سمجھتا تھا مگر یار! اگر یہ تم ہو تو آخر تم کیا کیا ہو؟

کچھ نہیں یار میں تو ایک..... پھر وہ چُپ ہوگیا گویا اُس نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے

جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میں نے بہتیرا زور لگایا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا ایک دن طے ہوا کہ ہم دونوں شکار پر جائیں گے۔ جنگل میں داخل ہوئے تو فطرت نے اپنے سحر میں لے لیا۔ ہم دونوں نے ایک ہرن کے پیچھے اپنے گھوڑے ڈال دیئے۔ ہرن اگر ہوا سے باتیں کر رہا تھا تو ہمارے گھوڑے بھی بجلیاں بن گئے۔ سرپٹ دوڑتے گھوڑوں سے ہم نے اپنی اپنی بندوق سے فائر کیے پھر ایک دوسرے کو نشانے کی داد دی ہم دونوں کے فائر نشانے پر لگے تھے۔

پھر ایک دن امریکی سفارت خانے کے بیرونی دروازے پر ہم قطار میں کھڑے تھے۔ ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں کی تصویر بنے جہاں ایک خوبصورت عورت ویزا نہ ملنے پر اُس کی ہچکیاں رکنے کا نام نہ لے رہی تھیں۔

گورگانی نے میری طرف ایک ایسی مسکراہٹ سے دیکھا، جس میں حیرت زدہ سوگواری شامل تھی۔ ویزا فارم کے کوائف درج کرنے کے دوران مجھ پر گورگانی کے اصل نام خیرالدین ہونے کا انکشاف ہوا تھا۔ معلوم نہیں خیرالدین کے نام کو خیرباد کہہ کے وہ کب گورگانی بن گیا۔ بہرحال میرے لیے یہ اتنی اہم بات نہ تھی۔ بس مجھے اُس کی دوستی پر فخر تھا۔ وہ ایک اچھا انسان اور ایک اچھا دوست تھا۔

ہمیں ایک بڑے ہال میں بٹھایا گیا ہال مختلف کھڑکیوں پر ویزا آفیسر بیٹھے نظر آرہے تھے میرے برابر والی سیٹ پر ایک صاحب اپنے ساتھ بیٹھے شخص سے گفتگو کر رہے تھے کہ بھائی اسلم میں تو دعا کر رہا ہوں کہ میرا نمبر کھڑکی نمبر نو (9) پر نہ آئے یہ تو (No) ہے۔ سُنا ہے یہ ویزا آفیسر سخت طبیعت کا آدمی ہے۔ گورگانی بھی یہ گفتگو سُن رہا تھا۔ ہم دونوں ہی اپنی اپنی جگہ بے چین سے بیٹھے تھے کہ گورگانی کا نام خیرالدین پکارا گیا کہ وہ کھڑکی نمبر 9 پر انٹرویو کے لیے آجائیں۔ میں نے گورگانی کو دیکھا۔ وہ اُٹھتے ہوئے تھوڑا نروس تھا، مگر جب وہ کھڑا ہوا تو ہمیشہ کی طرح پُراعتماد نظر آیا۔ کھڑکی پر مترجم کی سہولت بھی ہوتی ہے۔ سو ویزا آفیسر نے اُردو مترجم کو بھی بُلا لیا۔ میں نے دور سے گورگانی کو جیب سے کچھ نکالتے دیکھا۔ اُس نے بعد میں بتایا۔ اوہ یار اوہ آفیسر بار بار اپنا ہاتھ اپنی پیشانی تک لے جا رہا تھا۔ میں نے مترجم سے ہمدردانہ کہا لگتا ہے آفیسر کے سر میں درد ہے۔ مترجم نے آفیسر کو بتایا اُس نے مجھے بڑی دلچسپی سے دیکھا۔ میری جیب میں سردرد کی دوائی کا پتا پڑا تھا می نے اُسے دیتے ہوئے کہا میرا آزمودہ ہے وہ ایک گولی کھالیں اُنھیں آرام آجائے گا۔ مترجم نے آفیسر کو بتایا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں اُس نے میرا دیا ہوا پتا اپنے سامنے رکھ لیا۔ سوال و جواب شروع ہوئے۔ مترجم نے پتا واپس کرتے ہوئے کہا۔ ویزا منظور کر لیا گیا ہے۔ اب تم بتاؤ ویزا لگا، یا نہیں۔ میں نے کہا یار ہم دونوں کے بنک کوائف بڑے مضبوط تھے۔ ہم دونوں اکٹھے چلیں گے۔ یہ سُنتے ہی گورگانی کا چہرہ کھل اُٹھا اُس نے مجھے پرجوش اور محبت کے ساتھ اپنے گلے سے لگا لیا۔

اُس رات ہم نے بڑا جشن منایا۔ چاچا گورگانی

کی خالہ میرے عزیز اقارب اور حباب بھی شامل ہوئے میں نے گورگانی سے پوچھا بھی خالہ کے علاوہ کوئی عزیز شریک نہیں اُس کے ماں باپ کا بھی پوچھا۔ مگر اُس نے کہا یہ ذکر میرے لیے بڑا تکلیف دہ ہے جسے میں اپنے تک محدود رکھنا چاہتا ہوں۔ خالہ کا دم ہی میرے لیے غنیمت ہے جو میرے ساتھ رہی ہیں میرا خیال رکھتی ہیں پھر ایک دن ہم امریکہ کے لیے ایئرپورٹ پہنچے۔ پرواز کی پہلی منزل قطر تھی۔ ہر ایئرپورٹ پر فرسٹ کلاس / بزنس کلاس مسافروں کے لیے ایک علیحدہ لاؤنج ہوتا ہے جہاں اُنھیں کھانے پینے کی بلا معاوضہ سہولت حاصل ہوتی ہے ہم نے اگلی فلائٹ کے لیے کچھ وقت وہاں گزارا۔ قطر ایئرپورٹ، ہماری توقع سے زیادہ وسیع شٹل ریل۔ شٹل بیں خودکار چلتے ہوئے ایکسی لیٹرز فاصلوں فاصلوں پر موجود آپ کو چلنے کی بھی ضرورت کو کم کرتے ہوئے۔ ہر طرف ایک ہنگامہ ہائے ہُو۔ یا خدا بھانت بھانت کی آوازیں۔ گورے گورے رنگ کی سرو قد عورتیں کم سے کم لباس میں۔ بعض برقع میں ملبوس۔ ہم دونوں مختلف ٹالوں کی چہل قدمی کے بعد ایک کاوچ پر بیٹھ گئے۔ پشت پر ہمارے ملک سے تعلق رکھنے والے دو معمر آدمی بیٹھے جوانی کی رنگینیوں کے قصے سُنا رہے تھے۔ ایک نے کہا۔

یار الیاس!

میں سوچتا ہوں کہ یہ ساری حسین لڑکیاں پیدا ہونے کے لیے کیا میرے بوڑھا ہونے کا انتظار کر رہی تھیں ایک نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ پھر ایک شوخ و شنگ بوڑھے کی آواز اُبھری۔ محسن یار اُس نے سی سی کرتے ہوئے ایک جانب اشارہ کیا میرا دل چاہ رہا تھا اُس حسین لڑکی کو لائن مار کے آؤں۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے کہا۔ آن لائن منگوالو۔

دونوں نے مجھے بڑی برہمی سے دیکھا اور اُٹھ کر کہیں اور چل دیئے۔

گورگانی میری بات سے محظوظ ہوتے ہوئے کہنے لگا۔ یار آدمی کو اپنی عمر کے ساتھ چلنا چاہیے۔ ورنہ تماشا بن جاتا ہے۔

ریگستانوں کو سبزاروں میں بدلنے والے اُسے خوبصورت رنگوں سے سجانے سنوارنے تسکین۔ کمدوں میں بدلنے والے۔ بے انتہا سہولتوں کے حامل ایئرپورٹ جس کے بنانے میں ہمارا اپنا حصہ سیال سونے سے ریال، درہم، دینار باقی سب غیروں کی انجینئرنگ کے کمالات، مشینری، ٹیکنیکی اوزار..... ہم بھی ہیں تیرے عشق کے بیمار وغیرہ۔

ہم دونوں تو ہوائی جہاز پر موجود ایئرہوسٹس کی خدمات اور کھانے کے بعد اپنی سیٹ کو سلیپنگ بیڈ بنا کر سو گئے پھر صبح کا ناشتہ (ساڑھے 14 گھنٹے، قطر سے) کی پرواز کے بعد ہم نیویارک جے ایف کینیڈی ایئرپورٹ پر اُتر گئے اور اُس کے ساتھ ہی نہ جانے کتنے منظر نگاہوں میں اُتر گئے۔ خوش سلیقگی سے اپنے

بک کیے ہوئے سامان کی طرف جاتے ہوئے لوگوں کا ہجوم سے لے کر لیں سر۔ تھینک یو۔ ایکسکیوزمی کی آوازوں کے ساتھ۔ ہم نے بھی ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دل ہی دل میں جے ایف کینڈی ایئرپورٹ اور قطر ایئرپورٹ کا موازنہ کرتے ہوئے اُن کی خوبصورتیوں کو سراہتے ہوئے۔ ہم دونوں مختلف مراحل سے گزر کر باہر نکلے۔ جہاں نیوجرسی سے میرا کزن اسلم ہمارا منتظر تھا۔ نیوجرسی کو امریکہ میں گارڈن سٹیٹ کہا جاتا ہے نیوجرسی جاتے ہوئے ہماری موٹروے کی طرح وہاں ہر سڑک ہی موٹروے نظر آتی ہے۔

گورگانی ایئرپورٹ سے نیوجرسی کی خوبصورت شاہراہوں سے گزرتا ہوا بہت خوش تھا۔

نیوجرسی میں ایک منظر ہماری آنکھوں کے سامنے تھا حدِ نگاہ تک جھیل کا پانی اس قدر شفاف کہ تہہ میں پڑے ہوئے سنگریزے بھی نظر آتے تھے۔ ہم جس راستے سے گزر کر جھیل تک پہنچے تھے دو طرفہ درختوں سے گھرا ہوا تھا اور درختوں کی اِسقدر بہتات گویا ہم کسی جنگل میں ہیں، ہموار سڑک پر تیرتے ہوئے جا رہے ہیں۔ اس قدر خوبصورت جھیل، اردگرد اس قدر سبزہ کہ ہم کھو سے گئے۔

گورگانی کہنے لگا میں نے جھیل سیف الملوک کی بہت تعریف سُنی تھی۔ ایک مقامی، ہوٹل سے میں جیپ میں بیٹھ کر اُسے دیکھنے کے لیے نکلا۔ راستہ انتہائی مخدوش، ہچکولے کھاتے راستے پر ٹوٹے ہوئے پتھروں سے اَٹی ہوئی سڑک بعض بعض مقامات پر سڑک تک گلیشئر برف کے تودے، یقین نہ تھا کہ میں جھیل دیکھ پاؤں گا۔ بہرحال جھیل سیف الملوک آ گئی جہاں سُنا ہے پریاں اُترتی ہیں (بہت ہی بدذوق پریاں ہوں گی) وہاں نہ کہیں بیٹھنے کی جگہ نہ کہیں کھڑے ہونے کی۔ نہ کہیں سایہ نہ سایہ دار درخت بارش میں نہ جانے لوگ کیا کرتے ہوں گے۔ میں نے ایک شناسا سے پوچھا کہ سیاح یہاں کثرت سے آتے ہیں۔ کیا ایک ہموار سڑک نہیں بنائی جا سکتی۔ کہنے لگا جیپ مافیا سڑک بننے نہیں دیتی۔ میں نے پوچھا۔ کیا وہ حکومت سے زیادہ طاقتور ہے پھر میں اپنے ہی سوال پر ہنس پڑا۔ بہرحال کئی ایسے مقامات کہ جہاں نظر اُٹھے تو نظر ہٹانے کو جی نہ چاہے۔ ایک طرف دریائے کنہار بہتا چلا جا رہا ہے اطراف میں بادلوں کے پرے کے پرے حدِ نگاہ تک بلند و بالا برفانی چوٹیاں۔ سبزہ، برف، پانی پہاڑوں کا لامتناہی سلسلہ جہاں ایک مقام ایسا بھی آتا ہے جہاں دنیا کے تین عظیم پہاڑوں کا سلسلہ ایک مقام پر اکٹھا ہو جاتا ہے (قراقرم۔ کے ٹو۔ نانگا پربت) ایک طرف شاہراہِ ریشم دوسری جانب اُس کے بعد بننے والی شاہراہِ قراقرم مگر رابطہ سڑکیں ٹوٹ پھوٹ کا شکار یا ندارد۔

گورگانی کہنے لگا: یہاں رہنے والوں کی قوت

خرید بہت زیادہ ہے اُن کی سہولتوں اور آسائش کا حکومت نے بہتر اور متاثر کن انتظام کیا ہوا ہے۔
پھر گورگانی خیالات کی رو میں جانے کہاں چلا گیا۔ وہ کہہ رہا تھا دراصل جوں جوں انسان ارضی وسماوی آفات اور بیماریوں پر قابو پاتا چلا جا رہا ہے انسانی آبادی کا پھیلاؤ بڑھتا ہی جا رہا ہے ہمارے ہاں تو جنگلات کاٹ کاٹ کر آبادیاں بڑھائی جا رہی ہیں۔ دریا کے کٹاؤ بہاؤ کو کوئی اور شکل دی جا رہی ہے حتیٰ کہ آبادی کے بہاؤ کو متمدن آبادی میں تبدیل کرنے کے لیے سمندر کو بھی دھکیل دھکیل کر زمین حاصل کی جا رہی ہے قدرتی طور پر ماحول تو تبدیل ہوگا اس سے بہت سی پیچیدہ صورت حال کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے ایسے میں زمینی پیداوار کو آبادی کے مطابق بنانے کے لیے جو ذرائع اختیار کیے جاتے ہیں اُن سے حاصل شدہ خوراک میں وہ مزہ شامل نہیں ہوسکتا۔ جو کچ کے سوٹھا میں ہے ایسے ممالک جہاں آبادی بہت زیادہ ہے انتظامی امور کمزور تر وہاں معاشی تقسیم منصفانہ تو ایک طرف سرے سے کوئی تقسیم ہی نہیں تفریق ہی تفریق ہے وہاں بھوک ننگ پیدا ہوگی تو استحصال بڑھے گا۔ چھینا جھپٹی بے حسی بڑھے گی۔ جن ممالک میں دینی امور کو فوقیت دی جاتی ہے وہاں صورت حال خطرناک حد تک ابتر ہے یوں لگتا ہے آتش فشاں پہاڑ کے اُس حصے پر ہیں جہاں سے لاوا نکل کر بستیوں کو برباد کرنے کے لیے نکل پڑے گا۔ تعصبات زیادہ برداشت کم ہوتی جا رہی ہے۔ ایسے ملک کو تباہ و برباد کرنے کے لیے ڈرون حملوں کی بھی ضرورت نہیں۔ کسی ایک فرقہ کو دوسرے فرقے کے لیے ڈرون بننے والے آدمیوں کی کھیپ کی کھیپ موجود ہے۔

گزشتہ جنگ میں گھر ہی جلے مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ پرچھائیاں بھی جل جائیں

....

شہر پھیلیں گے تو چراگاہیں، کھیت کھلیان دور ہو جائیں گے۔ یہ ماحول پر مواصلات پر اس کا اثر ایک عمل کا ردعمل ہے انسان زیادہ ہوں گے تو ضرورتوں کا بڑھ جانا آبادی کا شہروں پر بوجھ بن جانا اُس کے لیے ماحول کی تنگی ترشی قبول نہ کرتے۔ بھی قبول کرنی پڑتی ہے۔ گو قدرت کا اپنا انتظام اور نظام ہے پھر بھی اگر کچھ حساس لکھنے والے صرف یہ لکھیں درختوں کا قتل عام بند کیا جائے۔ پہاڑوں سے معدنیات نہ نکالی جائیں کہ یہ زمین کی میخیں ہیں۔ ماحول کو خراب نہ کیا جائے اوزان کے شگاف، گلوبل وارمنگ کی وارننگ وغیرہ۔
اس قسم کی باتیں کرنے والے پلاننگ کرنے والے سب سے بڑے محرک ہتھیاروں کی بات نہیں کرتے جو افراتفری بدامنی بے چینی کے میدان جنگ بنے ہوئے ہیں۔ جنھوں نے ماحول کو زیادہ دوزخی بنایا ہوا ہے۔ اب اگر طاقتور ملک چھوٹے ملکوں پر ایسے دوزخی ہتھیار بنانے کی پابندی لگائیں تو وہ بھی خم ٹھونک کر کہتے ہیں۔ آپ بناتے ہو اور ہمیں ڈراتے ہو صدیوں سے یہ کھیل جاری ہے۔ ہر ملک خواہ وہ مذہب کا داعی ہو معاشی لحاظ سے طاقتور ملک ہو اپنی برتری کے زعم میں مبتلا بس مجھے

دیکھو۔ مجھے سمجھو۔ مجھے جانو۔ مجھ سے ڈرو۔ جناب خون کا رنگ ایک ہے، تو ساری دنیا کے لوگ ایک ہوئے کوئی دیوار، سرحد، پاسپورٹ، تعصب، نسل پرستی، عقیدہ پرستی کے بجائے انسانیت ہی پاسپورٹ ہو۔ ایک دوسرے کے ساتھ انسان کی حیثیت سے لپٹ کر ملو کوئی اونچ نیچ رنگ زبان آڑے نہ آئے۔

میں نے کہا یہ تم کہاں کی ہانک رہے ہو۔ یہ سب اگر مریخ پر بھی بس جائیں تو اُس کا زمین جیسا حال کر دیں گے۔ وہ زمین جس کی محض خشکی کی لمبائی چوڑائی پانی سے ایک چوتھائی ہے جہاں انسانوں نے انسانوں کا جینا مشکل کر دیا ہے۔ بم مار مار کر کیمیائی ہتھیار بنا بنا کر چلا چلا کر ہتھیاروں کا کوہ ہمالیہ سے بھی بڑا اونچا پھیلا ہوا پہاڑ بنا کر۔ تم کسے کسے سمجھاؤ گے۔ اللہ نے تو اب پیغمبر بھیجنے بھی بند کر دیئے ہیں۔

مگر گورگانی مجھے تو تمھاری اس تقریر پر حیرت ہو رہی ہے۔ میں کیسے مان لوں کہ بقول تمھارے کہ تم نے سکول کالج کی شکل نہیں دیکھی۔

ارے نہیں یار یہ سب والد کی بیٹھک کا فیض ہے جہاں صاحبِ علم و دانش اکٹھے ہوتے تھے پھر نیوجرسی میں ہم نے جتنے قابلِ دید مقام تھے دیکھے ہر مقام کا سفر اس قدر پُر لطف کہ تکان کو پر لگ جائیں پھولوں کو نیند آنے لگے۔ قوس و قزح باہیں پھیلا دے۔ ''رنگ باتیں کریں اور باتوں سے خوشبو آئے۔''

میلوں میں پھیلی ہوئی نیوجرسی کی سٹین فورڈ یونیورسٹی گئے۔ زندگی کا کیا خوبصورت تجربہ تھا دل چاہتا تھا ایک دفعہ پھر طالب علم بن جاؤں اس یونیورسٹی میں داخلہ لینے کے لیے۔ نیوجرسی میں ایک خوبصورت کتابوں کی دکان پر کئی مرتبہ جانے کا اتفاق ہوا۔ کتابوں کی تزئین و آرائش سے متاثر ہوا تو وہیں ایک طرف کتابیں پڑھنے کے شائقین کے بیٹھنے کا بہترین انتظام۔ وہیں پر بہت سے افراد اپنے اپنے لیپ ٹاپ پر مصروف کسی کتاب کے مطالعہ میں مستغرق۔ کوئی روک ٹوک نہیں نہ کتاب نہ پڑھنے پر نہ بیٹھنے پر، وہیں ایک چھوٹا سا ریستوران تھا جس چیز کو طبیعت چاہے خریدیے۔ میں ہیں ایک سٹال پر کھڑا کتابیں دیکھ رہا تھا معاً میری نظر ایک پوسٹر پر پڑی۔ اُس پر ایک جملہ تحریر تھا مجھے اچھا لگا:

The Difference Between a Garden and a Graveyard is only what we choose to put in the soil.

"Rudy Francisco"

میں گورگانی کو بتا رہا تھا۔ اُردو بازار میں ایک بک سٹال پر میں نے ایک کتاب دیکھنے کے لیے اُٹھائی۔ دکاندار کا غصہ سے اتنا بُرا حال ہو گیا کہ منہ سے کف جاری ہونے لگا کہ کتاب اُٹھائی تو کیوں اُٹھائی ہے میں نے جواباً کسی غصہ کا اظہار نہیں کیا کہ بھائی کتاب دیکھ کر ہی تو خریدی جاتی ہے مگر وہ

پھر بھی اپنے غصہ کا اظہار کرتا رہا۔ اُس دن مجھے معلوم ہوا کہ برداشت کسے کہتے ہیں۔

یہ واقعہ مجھے آج بھی پہلے دن کی طرح یاد ہے۔ ایک یہ نہیں کوئی بھی کتاب اُٹھا کر دیکھو۔ پڑھو...... جی چاہے تو ٹیبل پر چھوڑ کر چلے جاؤ یا جس جگہ سے اُٹھائی تھی وہیں رکھ دو۔ گویا علم بانٹ رہے ہیں گورگانی جی سنتے ہو۔ ہاں نہ یار سُن ہی رہا ہوں۔ ہمارے ہاں تو خان جی! موبائل کے ذریعے علم یا اسلام پھیلایا جا رہا ہے۔ روزانہ ہی ایسے ایسے کلمات بھیجتے ہیں جس پر وہ خود عمل نہیں کرتے۔ میں تو اُنھیں ''ڈیجیٹل مولوی'' کہتا ہوں۔

اگلے دن ہم نے نیویارک کا چکر لگایا عجائب گھر، ٹائم سکائر۔ ڈاؤن ٹاؤن، مجسمہ آزادی اور مختلف جگہ کی سیر کی یہ شہر تو ساری رات جاگتا ہے ساری دنیا کے لوگ اِسے دیکھنے کے لیے آتے ہیں اور یہ اُنھیں دیکھتا ہے تھکتا نہیں.....

ہم دونوں امریکہ سے واپس آ گئے ہیں مگر سفر کے دوران میں نے ایک نیا گورگانی دریافت کیا ہے، مگر اس شخص نے یہ دوہرا نقاب کیوں چڑھا رکھا ہے؟

دو دن سفر کی تھکان اُتارنے کے بعد گورگانی کہنے لگا کہ وہ چھ سات دن کے لیے گاؤں جانا چاہتا۔ ایک عرصہ کے بعد اُس نے گاؤں جانے کا نام لیا تھا میں نے کہا تو پھر میں بھی تمھارے ساتھ چلتا ہوں۔ اُس نے قطعیت کے ساتھ کہا نہیں خان جی میں اکیلا جانا چاہتا ہوں۔

چار دن بعد میں بھی اُس کے بغیر اُکتاہٹ محسوس کرنے لگا۔ میں نے اپنے کزن کے ساتھ شکار کا پروگرام بنا لیا۔ شام کو جب میں اپنے گھر میں داخل ہونے لگا تو میں نے گورگانی کے گھر سے اُس کی خالہ کی چیخوں کی آواز سُنی میں گھبرا گیا گورگانی کے گھر کے دروازے سے جب اندر داخل ہوا تو میری نظر ایک کوبرا سانپ پر پڑی جو اپنا پھن ہوا میں لہرا رہا تھا اور گورگانی کی خالہ کی گھگھی بندھی ہوئی تھی میں نے اپنی شکاری بندوق سے اُس کے پھن پر فائر کیا وہ تڑپ کر وہیں مر گیا۔ میں نے گورگانی کی خالہ صفیہ کو سنبھالا جس کا چہرہ خوف و دہشت سے سفید پڑ گیا تھا وہ پھر مجھ سے لپٹ کر رونے لگی۔ خالہ صفیہ میں نے اُسے مار دیا ہے کچھ نہیں ہوگا میں نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ آپ سکون سے لیٹ جائیں میں اُسے پھینک کر آتا ہوں مردہ سانپ کو پھینک کر میں واپس آیا تو خالہ صفیہ نے اپنے آپ کو قابو پا لیا تھا۔

میں نے یونہی سرسری طور پر پوچھا۔ یہ گورگانی جانے کب آئے گا؟ خالہ صفیہ نے غیر دانستگی میں جواب دیا۔ جب وہ چلی جائے گی۔ کون چلی جائے گی خالہ۔ کچھ نہیں کچھ نہیں۔ اب مجھے بھی تشویش ہوئی۔ خالہ صفیہ جی آپ کو میری جان کی قسم گورگانی سے اُس کے دل کی بات نکلوانا تو شاید مشکل ہے مگر آپ تو کچھ بتائیں۔ دیکھو خان جی یہ گورگانی کا ایک راز ہے تم مگر اُس کے واحد دوست ہو اور وہ تم سے بڑی محبت کرتا ہے بلکہ جان دیتا ہے مگر خدارا اُسے پتہ نہ چلے اس لیے

بتا رہی ہوں۔ وہ ثانیہ کو دیکھنے گیا ہے وہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے مگر اُس کے باپ نے اُس کی شادی کسی اور جگہ کر دی۔ اب اُسے پتہ چلا ہے کہ وہ اپنے باپ کے گھر آئی ہے تو یہ گاؤں چلا گیا کہ شاید وہ ثانیہ کو دیکھ لے۔ بس دیکھنے کی اُمید پر وہ گیا ہے اور میں جانتی ہوں وہ صرف اُسے دور سے ہی سہی صرف دیکھنا ہی چاہتا ہے اپنی شادی پر بھی رضامند نہیں ہوتا کہتا ہے محبت تو ایک بار ہی ہوتی ہے جس سے بھی ہو جائے عجیب قنوطیت ہے اُس کی محبت میں بھی جس کی خاطر اُس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی وہی اُسے نہ مل سکی۔

میں سناٹے میں آ گیا گورگانی آخر تو کیا ہے؟ کیا ہے تو آخر؟ تو نے یہ دوہرا نقاب کیوں چڑھا رکھا ہے؟

دس دن بعد جب وہ آیا تو میں نے اُس سے ملنے سے انکار کر دیا۔ میں کھڑکی سے اُس کا افسردہ چہرہ دیکھ رہا تھا۔ اگلے دن وہ پھر میرے گھر آیا تو اُس نے ملازم سے نہ ملنے کا سُن کر ایک پرچہ پر کچھ لکھا اور ملازم کو دے کر چلا گیا..... پرچہ کھول کر میں نے پڑھا۔ اُس میں صرف یہ لکھا تھا۔ کیا تم نہ مل کر مجھے مارنا چاہتے ہو؟

میں روتا ہوا باہر آیا اور اُس سے لپٹ گیا وہ بھی رونے لگا۔ میں نے کہا گورگانی تم ایک طرف تو مجھے دوست کہتے ہو دوسری طرف مجھے اپنا بھی نہیں سمجھتے۔

نہیں خان جی! ایسا نہیں ایک تم ہی تو ہو جس کی دوستی پر مجھے فخر ہے۔ پھر میرے اصرار پر اُس نے کہا۔ میں ثانیہ سے محبت کر بیٹھا اُس کا باپ جہالت سے نفرت کرتا نفرت تھا۔ میں اپنے خاندان کا واحد لڑکا ہوں جس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی صرف ثانیہ کو حاصل کرنے کے لیے اُسے ٹوٹ کر چاہا دنیا کی ہر چیز سے زیادہ۔

ثانیہ نے کہا تھا میرے والد تمھارے خاندان کے کسی فرد کو جاہل ہونے کی وجہ سے اچھا نہیں سمجھتے۔ بلکہ نفرت کرتے ہیں۔ مگر شاید وہ مان جائیں مگر یاد رکھنا میں اپنے ابو سے بہت محبت کرتی ہوں۔

مجھ سے بھی زیادہ میں نے پوچھا

ہاں تم سے بھی زیادہ اُس نے دوٹوک جواب دیا اور جب میں رشتہ کے سلسلے میں اُس کے باپ سے ملا تو اُس کے باپ نے میرے منہ پر میری ڈگری مارتے ہوئے کہا کبھی بھی یہ بات نہ سوچنا کہ میں جاہلوں کے خاندان میں اپنی بیٹی بیاہ دوں گا۔ ثانیہ کو گولی مار دوں گا اگر اُس نے کبھی یہ سوچنے کی بھی حماقت کی شاید کوئی پرانی تلخ بات بھی اس انکار میں شامل ہو۔ میرے والد اور وہ بھارت میں ایک جگہ گوڑ گاؤں کے رہنے والے تھے۔ اپنا گورگانی نام میں نے اُس گاؤں کی نسبت سے اختیار کیا تھا۔ جس دن اُس کی شادی ہوئی میں نے اپنی تمام کتابیں ڈگری سمیت جلا ڈالیں اور تہہ کر لیا کہ باقی زندگی جاہل بن کر گزار دوں گا۔

☆☆☆☆☆

پچیس سال

جسونت سنگھ جنگل کے اُس پار ہمارا گاؤں بھی اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ آباد تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب بچے ٹولیاں بنا کر اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سرگرداں ہوا کرتے تھے۔ پیڑ جھومنے کے لیے بے تاب اور پرندے چہچہانے کے لیے صبح کاذب کے منتظر رہتے۔ ڈھور ڈنگر سرسبز چراگاہوں کا رخ کرتے اور شام ہوتے ہی لوٹ آتے تھے۔ لوگوں کے دل صاف اور ایک دوسرے کی محبت میں سرشار ہوا کرتے تھے۔

وقت نے پلٹا کھایا، اب میں بھی اسی گرداب میں پھنس چکی ہوں، جانے! کیا ہو رہا ہے؟ تب عزتِ نفس تک بھی مجروح نہ کی جاتی اب تو عزتیں بھی تار تار ہو جاتی ہیں۔ ماضی کا عکس میری آنکھوں کے سامنے دھندلا نہیں ہوا بلکہ واضح طور پر نقش ہے۔ ایک خطا کا ناقابلِ تلافی نقصان بھلا کیا کچھ نہ بگاڑ گیا، میں ہر اذیت ناک لمحے سے گزر کر اس وحشت زدہ بیاباں میں کھڑی ہوں کہ ہر ایک خیال نامکمل اور مبہم نظر آتا ہے۔ وہ خطا بھی میری نہیں، کسی اور کی تھی۔

کہنے والے کہتے رہے اور سننے والوں نے کان نہ دھرے۔ میں بے زبان جانور کی طرح گلے پر چلتے تیز دھار آلے کی زد میں آئی۔ میری چیخ تو درکنار، سرگوشی بھی کسی نے نہ سنی۔ اب جب کہ چلاتے چلاتے میرا گلا خشک ہو چکا اور سننے والے کان اب بھی نہیں رہے۔ میں بربادی دل کا سوز کس سے بیان کروں؟ کون چارہ گر ہے جو میرے رِستے زخموں پر مرہم لگائے۔۔۔ مرہم تو دور کی بات ہے اب تو ہر گام پر مجھے طنز کے نشتر سہنے پڑتے ہیں اور اپنے بھی میرے زخموں پر نمک چھڑک کر میری تڑپتی روح کو بے چین ہوتے دیکھ کر سکون محسوس کرتے ہیں۔

یکم مئی میری زندگی کا بدنصیب دن تھا یا خوش نصیب دن۔۔۔ کچھ نہیں معلوم، مگر! اتنا یاد رہا کہ وہ دن میرے لیے کرب ناک لمحوں اور تڑپ تڑپ کر جینے کی ابتدا ٹھہرا۔ میرے منہ سے فقط اتنا نکلا تھا ''مجھے تاشفین کے ساتھ بیاہ دو۔۔۔'' شاید! میری زبان کاٹ کر رکھ دی جاتی، مگر! ایسا کرنا ان کے بس میں نہیں تھا۔ تاشفین، نام ہی ایسا تھا جس سے آگ بگولہ ہونا ان کے لیے تو یقینی تھا میں جن کے گھر پیدا ہوئی، مگر! میرے لیے ایک سکون آور شے کے مترادف تھا۔ اُس نام میں جو چاشنی تھی وہ کسی اور نام میں نہیں تھی۔

بات نکلے گی تو دور تلک جائے گی۔۔۔ یعنی اب مجھے تو اپنی سہیلیاں بھی ملامت کرتی رہتیں کہ آپ اپنا حق لینے میں بھی کامیاب نہ ہو سکیں، بھلا! عمر بھر کے عہد و پیمان کیسے پورے کر سکتیں۔۔۔ سب سننا اور سہنا پڑتا۔ ایک ایک لفظ کا گھاؤ اتنا گہرا تھا کہ بدن شل ہو چکا تھا۔ اب میرے کان کسی اور لفظ کو سننے کی ہمت نہیں رکھتے تھے۔

تاشفین نے بھی اپنی طرف سے ہر وہ کوشش کی تھی جس کا وہ اختیار رکھتا تھا۔ مگر! سنی بات ان سنی کر دینے والے لوگ کہاں اس طرح کی باتوں کو سمجھتے ہیں۔ پرانی رنجشوں کو انا کا مسئلہ بنا دینے والے پتھر دل لوگ کیا جانیں کہ دو دلوں کی خوشی زندگی بھر تمھارے احسان کی قرض دار رہے گی۔ کسی کی ہٹ دھرمی سے جب کسی بے بس انسان کا دل ٹوٹے تو سمجھو نفرتوں کے دیے اس طرح روشن

عطا السلام سحر

ہوتے ہیں کہ جن کا بجھانا عمر بھر کے لیے ناممکن ہے۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہوا کہ اپنوں کے ستم جھیلتے جھیلتے ایسی نفرت کی آگ نے جنم لیا جس کا بجھنا ممکن نہیں ہے۔ بھلا ایسی آگ کیا کرے گی اب، جب میرا سب کچھ اجڑ چکا ہے۔

اماں نے کہا تھا نیلوفر تمہارا گلا دبایا جا سکتا ہے، لیکن! تاشفین سے بیاہ دینا کسی صورت بھی قبول نہیں ہے۔ ابا جان تو رہے نہیں تھے جو میری داستانِ غم سنتے--- اماں کا اس طرح کہنا، میرے لیے وہ لمحہ قربِ قیامت سے کم نہیں تھا۔ کیا گناہ کیا تھا میں نے؟ میں اپنے آپ سے بار بار یہی سوال کر رہی تھی۔ کبھی خیال آتا کہ حق مانگنا اس دنیا میں کتنا مشکل کام ہے۔ تاشفین کوئی جرائم پیشہ نہیں تھا، نہایت سادہ اور خوش مزاج تھا۔ فقط اتنا تھا کہ اس کے خاندان سے ہمارے خاندان کی پرانی رنجش تھی۔ رنجش بھی کیا تھی؟ فقط خود اپنے ذہن میں آئے گئے شکووں کے جواب گھڑ لینے سے پیدا ہوئی تھی۔ سب کچھ بدل سکتا تھا، اگر انا آڑے نہ آتی تو---

تاشفین نے بھی سو جتن کیے مگر! دونوں طرف سے حال برابر تھا۔ اب بھلا کون قصوروار تھا؟ مجھے یہی لگا کہ کاش! وہ لمحہ قیامت خیز تھا جس لمحے ہم نے ایک دوسرے کو دیکھنے کے بعد ہمیشہ کے لیے جدائی اپنا نصیب کر لی تھی۔ اس لمحے شاید! قصور مجھ سے ہوا تھا۔ گناہ سے کوسوں دور پھر بھی تو عزت مانگی تھی۔ مگر! بڑوں کی انا کی بھینٹ چڑھتے اور اپنے خوابوں کو ٹکڑے ٹکڑے ہوتا دیکھنے سے بہتر ہے کہ موت کی آغوش میں چلی جاتی--- مرنا بھی تو اپنے بس میں نہیں ہے۔ موت کا ایک دن مقرر ہے۔ منہ مانگی موت آ جاتی تو میری پہلی دعا یہی ہوتی کہ بلا لے اپنے پاس! اے کارسازِ دوجہاں---

پچیس سال بیت چکے ہیں۔ چند روپوں کے لالچ نے میرا گھر بدل دیا۔ کہاں میں دوشیزہ، کہاں میرا چالیس سالہ ہم سفر--- زندگی کی گاڑی فقط چلی تو چار برس--- دو گھر پھر سے بکھرے اور ایسے بکھرے کہ جن کا دوبارہ جڑنا ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ میرے خواب تو پہلے ہی ٹکڑے ٹکڑے ہو چکے تھے، مگر! تھوڑی بہت جینے کی جو رمق باقی تھی وہ بھی دوسری بار ہمیشہ کے لیے ماند پڑ گئی۔ میں اپنے آپ سے مخاطب ہوئی: "نیلو! تیرا گھر تو پہلے ہی اجڑ چکا تھا، اب مزید کسی دوسرے مہرباں کی ضرورت نہیں رہی---" اب مجھے سوائے اپنوں کے اور کوئی نظر نہیں آتا جسے میں اپنے اجڑنے کا ذمہ دار ٹھہراتی۔ اماں نے کوچ کر جانا تھا، وہ تو چلی گئی، اب میرا ساتھ کون دے گا؟ اماں کی انا یا بھائیوں کا منہ پھیر لینا؟ بھائی جو کل تک اپنا ہر فیصلہ اماں کے سپرد کر دیا کرتے، کاش! تب وہ میرے حق میں بول پڑتے تو میں ان حالات سے دوچار نہ ہوتی--- تب سب ہی گونگے اور بہرے تھے۔ ہم چار بہنیں تھیں، ایک کے سوا سب اماں کی ہم نوا تھیں۔ نیلوفر تنہا تھی۔ بہنیں بھی بیاہ کر سدھار گئیں، کبھی حال دل پوچھیں بھی تو کہاں دل کو سکون ملتا ہے۔

تاشفین مجھ سے کیا بچھڑا، ذہنی توازن ہی کھو بیٹھا۔ جب کبھی جسونت سنگھ جنگل میں سے ایک زوردار چیخ عالم سکوت کو چیرتی ہوئی بلند ہوتی ہے تو میرا دل دہل جاتا ہے۔ یہ تاشفین کی چیخ ہے--- میرے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا۔ یہی میری خطا تھی، جس نے میرا جینا حرام کر دیا۔ آخر قصوروار کون ہے؟ مجھے اس سوال کا جواب کون دے گا؟ میں سوچتے سوچتے تھک گئی۔ مگر! جواب ندارد--- بڑوں کی انا سے ایک چیختے چلاتے موت کے منہ تک پہنچے گا، میرے سر میں بھی چاندی اتر آئی ہے۔

☆☆☆☆☆

سیتاپور ریلوے جنکشن

رات کا آخری پہر تھا، ریل گاڑی ریلوے اسٹیشن پر رکی، اس نے دسمبر کی ٹھنڈی رات میں ریل کے شیشے سے پلیٹ فارم کے اوپر لکھے اسٹیشن کے نام کو پڑھنے کی کوشش کی کہ کہیں وہ کسی غلط اسٹیشن پر نہ اتر جائے۔ رات کی اس تاریکی میں پلیٹ فارم پر میں صرف ایک بلب تھا اور باقی گھپ اندھیرا، اس نے بڑی مشکل سے اسٹیشن کا نام پڑھا ''سیتاپور ریلوے جنکشن''۔

اس نے بغیر کسی توقف کے ریل کے ڈبے میں سے باہر جانے والا راستہ پکڑا اور اگلے ہی لمحے وہ ریل سے باہر اسٹیشن پر کھڑا تھا۔ ریل کے بارہ ڈبوں میں سے کسی ایک ڈبے سے بھی کوئی مسافر اترا اور نہ ہی اسٹیشن سے ہی کوئی سوار ہوا۔ دہلی سے آنے والی یہ واحد ریل تھی جو رات کو تقریباً دو یا تین بجے یا اس دوران کسی بھی وقت اسٹیشن پر رکتی۔ ریل سے آنے والے مسافر یہاں اتر جاتے۔ ریل کوئی پانچ منٹ اسٹیشن پر رکی رہی۔ سب لوگ جو ریل میں سوار تھے سو رہے تھے۔ ہر طرف گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ خاموشی اور اندھیرے کا راج تھا۔ انجن کی آواز اور انجن کے آگے لگی تیز بلب کی روشنی نے اس راج میں تھوڑی دیر کے لیے بغاوت کا علم بلند کیا۔ تھوڑی دیر بعد انجن کے آپریٹر نے رخصتی کا سائرن بجایا اور اس کے چند ہی سیکنڈ بعد ریل سائیں سائیں کرتی وہاں سے روانہ ہوگئی۔

اب اس اندھیرے اسٹیشن پر وہ اکیلا تھا۔ اسٹیشن ماسٹر اور کوئی قلی وغیرہ نہیں تھے اور نہ ہی کوئی گارڈ۔ ریل کے جانے کے بعد تو یہاں خاموشی اور اندھیرا مزید بڑھ گیا۔ اس نے فوراً ہی خوفزدہ بچے کی طرح اسٹیشن کے اندرونی انتظارگاہ کی طرف دوڑ لگائی وہاں ایک بلب روشن تھا اور چند لکڑی کے بنے ریلوے کے مخصوص بینچ تھے۔ جن پر گرد پڑی

راحیلہ خورشید

ہوئی تھی۔ ویسے اسٹیشن سارا ہی گرد و غبار اور کوڑا کرکٹ سے اٹا پڑا تھا۔

اک بینچ کو جھاڑ کر وہ اس کے اوپر بیٹھ گیا۔ ویسے اس کے پاس کوئی سامان اور بیگ نہیں تھا۔ سردی سے بچنے کے لیے اس نے ایک لمبا کوٹ پہن رکھا تھا۔ سر پر اون والی موٹی ٹوپی اور کانوں کے گرد سرخ مفلر لپیٹ رکھا تھا۔ کوٹ کے نیچے پتلون کے پائینچے نظر آ رہے تھے اور پتلون کے نیچے اس کے براؤن چمکدار جوتے اس کی شخصیت کے رعب میں اضافہ کر رہے تھے۔ اس ڈیل ڈول سے وہ کوئی افسر دکھائی دے رہے تھا مگر اس کی چال اور جسامت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ کوئی ریٹائرڈ فوجی افسر، کمشنر، وکیل، پروفیسر، بیوروکریٹ یا ڈاکٹر ہوگا۔

" نہیں آیا ---- آج بھی نہیں آیا ----- جمیل کے ابا!!!! ------ لو آج بھی نہیں آیا"۔

ادھیڑ عمر کی ایک عورت زناٹے سے ریلوے اسٹیشن میں داخل ہوئی اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ دوپٹہ یا گرم چادر آدھی جسم پر تھی اور آدھی راستے پر گھسٹی جا رہی تھی، بوسیدہ پرانا لباس جسم پر اور ننگے پاؤں آندھی کی طرح ریلوے اسٹیشن میں داخلی دروازے سے داخل ہو کر پٹڑی کی طرف بھاگی۔

" جمیل کے ابا ----- تم کہاں ہو؟ ----- آج بھی نہیں آئے ---- دیکھ میں روزانہ تمھارا انتظار کرتی ہوں"۔

وہ آدمی آدھی رات کو ویران اسٹیشن میں پہلے ہی خوفزدہ تھا اور غیر متوقع طور پر ایک عورت کا اس وحشیانہ انداز میں داخل ہونا اسے خوفزدہ کر گیا۔ ابھی وہ سنبھل ہی نہیں پایا تھا اسے اسٹیشن کے داخلی دروازے سے "اماں، اماں" کی آوازیں آنے لگیں۔

اتنے میں 20 برس کا ایک نوجوان افراتفری کے عالم میں داخل ہوا، ایسا لگ رہا تھا کہ وہ نیند سے بیدار ہو کر آیا ہے۔ قمیض اور شلوار کا الگ الگ رنگ تھا۔ غالباً یہ اس کا Sleeping Suit ہوگا۔ بال بکھرے ہوئے تھے اور اس کی سانس پھولی ہوئی تھی اور چہرے پر دہشت کے آثار نمایاں تھے۔ اسٹیشن میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر پہلے سے موجود شخص پر پڑی۔ وہ ایک ذرا سا ٹھٹکا، آدمی کو حیرت سے دیکھا اور باہر اسٹیشن کی طرف بھاگا۔

" اماں ------ اماں لوٹ آؤ ----- آجاؤ ادھر ------ گھر جاتے ہیں ---- دیکھ ٹھنڈ بہت ہے -------- تو بیمار ہو جائے گی۔"

تھوڑی دیر میں وہ اپنی ماں کو پٹڑی کے پاس سے لے آیا، نوجوان نے ماں کا بازو تھام رکھا تھا اور اس کے بالوں کو ترتیب دے رہا تھا اور چادر اس کے جسم کے گرد لپیٹ رہا

تھا۔ دونوں کی سانسیں بے ترتیب تھیں۔
اوورکوٹ میں ملبوس آدمی ماں بیٹے کو غور سے دیکھ رہا تھا اور اب قدرے سنبھل چکا تھا۔
دونوں اس کے سامنے سے گزرے تو عورت نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور سامنے بنچ پر بیٹھ گئی۔ نوجوان اپنی ماں کے پاس کھڑا ہو گیا اور سمجھانے لگا۔
"اماں سردی زیادہ ہے ------ چل گھر چلتے ہیں ---- وہاں آرام سے بیٹھ جانا۔"
عورت ضد کرنے لگی، "نہیں، میں نے گھر نہیں جانا ---- تیرا ابا آنے والا ہے ---- میں نے یہیں بیٹھ کر اس کا انتظار کرنا ہے ------ دیکھ یہ مسافر بھی تو آیا ہے ---- تیرا ابا بھی آجائے گا۔" نوجوان میری طرف متوجہ ہوا
"السلام علیکم!"
"وعلیکم السلام" معزز شخص نے دھیرے سے جواب دیا۔
"آپ سیتا پور کے ہیں ---- کوئی مہمان ہیں --- پہلے کبھی آپ کو دیکھا نہیں ---- کس کے گھر جانا ہے ---- میں کوئی مدد کروں آپ کی۔"
نوجوان نے یکے بعد دیگرے کئی سوال پوچھ ڈالے۔
"نہیں میں سیتا پور کا نہیں ہوں اور نہ ہی کسی کے گھر جانا ہے۔"
"اوہ ---- کہیں آپ غلطی سے یہاں اسٹیشن پر اتر گئے ہیں ---- یا گاڑی آپ کو یہیں چھوڑ گئی ---- آپ نے کہاں جانا تھا۔" نوجوان کا تجسس بدستور جاری تھا۔
وہ آدمی بولا، "نہیں میں سیتا پور ہی آیا تھا ------ میں غلط اسٹیشن پر نہیں اترا ---- نہ ہی ریل مجھے چھوڑ گئی ہے۔"
"تو سر آپ یہاں ---- اور رات کے اس پہر۔" نوجوان بولا۔
"جی مجھے کوئی کام تھا ---- صبح کر لوں گا۔"
"اوہ تو پھر میرے ساتھ چلیں ---- ابھی ٹھنڈ ہے سویرے اپنا کام کر لینا ---- آئیں چلتے ہیں۔" نوجوان نے پرخلوص دعوت دی۔
"نہیں نہیں -------- میں یہیں ٹھہروں گا۔" وہ آدمی بولا
"اچھا ---- جیسے آپ کی مرضی ---- میں کچھ مدد کر سکتا ہوں آپ کی۔" نوجوان اس اجنبی کی ہر طرح سے مدد کرنے کو تیار تھا۔
"شکریہ"
نوجوان پھر اپنی ماں کی طرف متوجہ ہوا
"اماں اب چلیں گھر۔" اتنی دیر میں عورت بنچ پر ٹانگیں پھیلا کر سو بھی چکی تھی اور اب اس کے بھونڈے خراٹے خاموش ماحول کو مزید ناگوار کر رہے تھے۔
"اوہ ---- اماں تو یہیں سو گئیں۔"
اس آدمی نے ذرا توقف کے بعد نوجوان کو مخاطب کیا۔

''آپ کے علم میں ہے کہ کوئی بیس بائیس سال پہلے سیتاپور کے نواب کا قتل ہوگیا تھا۔''

نوجوان کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

''ہاں ---- میں کیسے بھول سکتا ہوں وہ قتل --- وہ قتل میری پیدائش سے چند ماہ پہلے کا ہے ---- مگر آپ کیوں پوچھ رہے ہیں''۔

''نواب صاحب کو ان کے مالی نے قتل کر دیا تھا۔'' وہ آدمی بولا

''جی نہیں ---- آپ کی معلومات درست نہیں ہیں --- نواب صاحب ایک نیک، شریف اور ایماندار نواب تھے اور وہ مالی ان کا بڑا ہی نمک خوار ملازم تھا۔'' نوجوان قدرے جوشیلے انداز میں بولا۔

''مگر تمام ثبوت، گواہ اور موقع واردات پر موجود آلہ قتل اور اس پر مالی کے فنگر پرنٹس اور مالی کا خون آلود لباس سب مل کر اسے قاتل ثابت کر رہے تھے۔'' وہ آدمی روانی سے بولا۔

نوجوان نے تردید کرتے ہوئے کہا کہ ''نواب کو ان کے بھائی نے خود اپنے ہاتھوں سے قتل کیا، ریاست پر قبضہ کرنے کی خاطر، اور اس بات کے ایک دو نہیں پورا گاؤں ہی گواہ ہے۔ مگر کس میں ہمت ہے کہ نواب کے مقابلے میں گواہی دے سکے، یہ نواب ایسا ہی کرتے ہیں! قتل خود کرتے ہیں، پھنسوا کسی اور کو دیتے ہیں۔'' نوجوان کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ اس کا ہاتھ بھی کانپ رہا تھا اور اس کا چہرہ لال ہو رہا تھا۔

''مگر آپ یہ سب کیوں پوچھ رہے ہیں؟--- آپ کون ہیں؟---- آپ کو اس بیس برس پرانے گڑھے مردے اکھاڑنے سے کیا دلچسپی ہو رہی ہے۔''

وہ آدمی چند لمحے خاموش بیٹھا رہا۔ جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں پھر اس نے چہرہ ہاتھوں سے ڈھانپ لیا، جیسے وہ اس نوجوان سے اپنا چہرہ چھپا رہا ہو یا خود سے ہی چھپنے کی کوشش کر رہا ہے۔ نوجوان بدستور اجنبی کو دیکھتا رہا۔

''میں ہی وہ بدقسمت جج ہوں جس نے مالی اجمل کو سزائے موت کا حکم سنایا تھا---- میں کیا کرتا ------ بیشمار گواہان موجود تھے --- اجمل مالی نے بھی اقرار جرم کر لیا تھا۔ نواب کا وکیل بھی خاصا تگڑا تھا--- ایسے دلائل اور ثبوت لے کر آیا کہ عدالت کو اپنا فیصلہ سنانا ہی پڑا۔''

''عدالت ---- یا جج صاحب آپ کو فیصلہ سنانا پڑا۔'' نوجوان نے پوچھا

''تم ٹھیک کہتے ہو---- میں نے ہی فیصلہ سنایا---- مگر اس وقت کوئی بھی ہوتا تو یہی فیصلہ سناتا--- مگر تمہیں ایک بات بتاؤں بطور جج مجھے اپنا فیصلہ آج بھی درست

نظر آتا ہے مگر بطور انسان ------"

جج صاحب ذرا رکے --- رومال سے اپنا چہرہ صاف کیا --- مفلر ذرا ہلکا کیا اور ٹوپی اتار دی۔

دسمبر کی ٹھنڈی رات میں بھی ان کا ماتھا پسینے سے بھرا ہوا تھا۔ نوجوان اب جج صاحب کے چہرے کو صحیح طرح دیکھ سکتا تھا۔ نوجوان نے کلام کا سلسلہ جاری رکھنے کے لیے پوچھا

"بطور انسان کیا جج صاحب ---"

"بطور انسان مجھے اس مقدمے میں کچھ گڑ بڑ محسوس ہو رہی تھی۔ جج تو عدالت کے کمرے میں بیٹھا ہوتا ہے اسے تو وکلا، گواہان اور ثبوت پیش کرتے ہیں اور ان کے مطابق ہی فیصلہ کرتا ہے، وہ مجبور ہوتا ہے۔ وہ بھی دل رکھتا ہے۔ اس کا دل کہتا ہے کہ کہیں کچھ غلط ہو رہا ہے مگر وہ اپنے دل کی بات کو عدالت میں ثابت نہیں کر سکتا۔"

"ہوں" نوجوان غصے کی شدت سے بولا۔

"اور یہ بات میرے ضمیر پر اک بوجھ بن گئی --- اس کیس کے کچھ عرصے بعد ہی میں نے ملازمت سے استعفیٰ کے ذریعے ریٹائرمنٹ لے لی --- زیادہ تر وقت گھر پر رہتا ---- نماز، تلاوت، ذکر و اذکار کرتا --- مگر چین نہیں مل رہا تھا۔" جج صاحب کی آواز میں لغزش تھی، ان کے ہونٹ تھر تھرا رہے تھے۔ بائیں آنکھ سے داڑھی پر گرنے سے پہلے ہی انھوں نے رومال سے آنسو کو پونچھ ڈالا۔ نوجوان بولا،

"اور آپ کو ضمیر کا بوجھ یہاں پر لے آیا۔"

"ہاں ہاں ----- میں مالی اجمل کی قبر پر جانا چاہتا ہوں ------ رو کر گڑگڑا کر معافی مانگنا چاہتا ہوں --- شاید دل کا بوجھ موت سے پہلے کچھ کم پڑ جائے"۔ ----- تم مجھے ان کی قبر دکھا دو گے۔"

"جمیل!! نہیں آیا تیرا ابا --- چل گھر چلتے ہیں ------ اب تو صبح ہونے والی ہے۔"

اسی اثنا میں عورت کی آنکھ کھل گئی اور وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی، نوجوان اس کے پیچھے پیچھے روانہ ہوا۔ اسٹیشن کے داخلی دروازے پر رک کر نوجوان مڑا اور بولا۔ "جج صاحب اسٹیشن کے بائیں کھیتوں کے آخر میں اکلوتی کچی قبر اجمل مالی کی ہے۔"

یہ کہہ کر نوجوان جانے کے لیے مڑا اور دروازے پر ہی رکا رہا اس کی پشت جج صاحب کی طرف اور منہ دروازے کی جانب تھا وہ بولا!!

"اور جج صاحب ---- میں بدقسمت مالی اجمل کا بیٹا ہوں جوان کی سزائے موت کے بعد پیدا ہوا تھا اور یہ بدنصیب میری ماں دہلی سے آنے والے ہر ریل میں اپنے شوہر کو ڈھونڈ رہی ہے ---- اور جج صاحب آپ مطمئن ہو کر جائیں ہم نے آپ کو معاف کیا۔" -------

☆☆☆☆☆

ماں

شام ہوتے ہی لوگ ہمارے گھر آنا شروع ہو گئے، جہاں تمام کمروں میں گلاب کی خوشبو پھیلائی جا رہی تھی۔ سفید چادریں کمروں کے فرشوں پر بچھی تھیں۔ گھر میں موجود ہر شخص میری ماں کے ساتھ گزرے لمحوں کو یاد کر رہا تھا۔ آج ان کی برسی تھی، مگر میں اس تمام شور کو نظر انداز کرتے ہوئے ماں کے کمرے کی جانب بڑھا اور بیچارگی کے عالم میں جا کر ان کے بستر پر بیٹھ گیا۔ آنسو میرے گالوں سے ٹپکتے ہوئے تکیے میں جذب ہو رہے تھے اور میں اپنا ہاتھ بستر پر پھیرتے ہوئے ماں کو جیسے اپنے ساتھ بیٹھا محسوس کر رہا تھا۔ خود کلامی میں ماں کی ضرورتوں کا پوچھ رہا تھا۔ ان سے لڑ رہا تھا پھر معافی مانگ کر ان کے گلے لگ رہا تھا، مگر آج کوئی بھی مجھے جواب دینے والا کمرے میں موجود نہیں تھا۔

''امی آپ بہن بھائیوں میں سب سے زیادہ کس سے پیار کرتی ہیں، تم سے۔''

میرا یہ سوال پوچھنے پر ماں کا کپکپاتے ہونٹوں سے میری پیشانی کا بوسہ لیتے ہوئے بے ساختہ مجھے یہ جواب دینا ہی بہن بھائیوں میں مجھے اکڑفوں بناتا تھا۔ اور آج جب وہ اس دنیا میں نہیں مگر ''وہ مجھے سب سے زیادہ عزیز ہیں'' ایسا میں انھیں کہنا چاہتا ہوں۔ مگر کمرے کی ویران دیواریں میرا منہ چڑا رہی تھیں۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کہ دنیا کی تمام نعمتیں، خوشیاں، لطافتیں، آسائشیں اس ہستی کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ وہ ہستی جو سنسان راتوں میں شور کرتے اپنی گود میں رکھے مستقبل کو متوجہ کر لیتی ہیں۔ جس کا دلارنا از سر نو تازگی حیات ہے اور جس کے کہنے پر مالک کائنات بھی اپنا فیصلہ بدل دیتا ہے۔ بچپن میں جب ضرورتیں مجھے اپنی طرف بلاتیں اور میں دنیاوی زندگی کے رموز کو سمجھے بغیر کہ جہاں اکثر مسرتوں کے خلاف سازشیں ہوتیں ہیں اور صبر

محمد علی نجیب

مدہوش ہوتا ہے، بلا جھجک ان کی طرف دوڑ پڑتا۔ اس یقین پر کہ ماں میری چاہتوں پر ثبات کی مہر لگا ہی دے گی، مگر میری ان تمام ضرورتوں کو پورا کرنے کی خاطر اپنی ماں کی روح کو حد درجہ بیقرار ہوتے اور جستجو کرتے قطعی نہ دیکھ پاتا۔

پھولوں سے بڑھ کر معصوم اور قوس وقزاح سے کہیں زیادہ خوش رنگ حسین ہستی کہ جس میں شبنم کا سا احساس اور دلفریبی ہے۔ انسانی آرزوؤں کا پابند ہوتے ہوئے بھی اپنی اولاد کا شاندار مستقبل تعمیر کرنے میں آزاد اور فیصلہ کن۔ ماں ایک ایسا مجسمہ محبت ہے جو قربانیوں، معافی اور برداشت سے مل کر بنا ہے۔ نیز جس کا حسین تبسم بکھرے وجود کو کامل کردے۔

ماں مجھے گھر کے مختلف کمروں میں پھرتی دکھائی دے رہی تھی۔ کبھی میرے باپ کی شکایت کرتے ہوئے، کبھی اپنی شادی شدہ بیٹیوں کی خوشیاں بتاتے ہوئے کبھی مجھے ڈانٹ کر اپنی بات منواتے۔

ایام جوانی میں زندگی کے راستوں میں بھٹکتا ہوا خود میں گم اکثر میں ماں کی باتوں کی نفی کر جاتا، مگر ماں اپنی آنکھوں میں ضبط کا پانی لیے مہربان دل مگر خاموش کپکپاتے ہونٹوں کے ساتھ گھر کے صحن میں جا بیٹھتیں۔

ماں ایک نعمت ہے انمول نعمت، جس کا نعم البدل کوئی نہیں، جو ساری رات اپنی اولاد کی کامیابی کے لیے دعا گو رہتی ہے پھر چاہے معاملات کچھ بھی ہوں۔

آہ! وہ آگ سے بھی زیادہ دہکتا منحوس دن کہ جب ماں میرے سامنے بستر پر بے سدھ پڑی اس دنیا نفرت گاہ سے بہت دور جا چکی تھی۔ ابھی تو وہ شیریں لمحات ماں کی زندگی میں آنا شروع ہوئے تھے کہ جب وہ رشتے داروں کو میری کامیابیوں کا بتا کر مسرت سے جھوم جھوم جاتی میری بلائیں لیتی، مجھے دعائیں دیتی مگر اس گلشن حیات کا دیدنی منظر ماں کے اچانک جانے سے فضاؤں میں کہیں منتشر ہو گیا۔ کس قدر دردانگیز ہوتا ہے وہ لمحہ جب کوئی پیارا ہماری آنکھوں کے سامنے دنیا چھوڑ جاتا ہے اور ہم بے بسی کی تصویر بنے آنکھوں میں سمندر لیے اسے دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ کتنی قابل رحم اور بے بس ہے یہ انسانیت کہ قدرت کبھی بھی کچھ بھی اس سے چھین لے۔ پر مشیت الٰہی کے آگے کس کی چلے!

سوچوں کے سمندر سے نکلتے ہوئے میں نے ٹھنڈی سانس لی اور بھیگی آنکھوں کے ساتھ بستر سے اُٹھا۔ باہر کے کمرے میں ماں کے لیے دعا کروانے آ گیا۔ میرے آس پاس گلاب کی خوشبو مزید پھیل گئی۔ مجھے لگا ماں اپنے کپکپاتے ہونٹوں سے میری پیشانی پر بوسہ دینے آئی ہے اور کچھ پوچھ رہی ہے۔

☆☆☆☆☆

غزل

درد کی سُنسنی نہ تھی، رُوح کے برف زار میں
آگ ابھی لگی نہ تھی، رنگ بھرے چنار میں

لفظ شرارتوں بھرے، ہونٹ حرارتوں بھرے
کوئی بھی گھر نہ جا سکا، شام کے انتظار میں

لفظ عبارتیں ہُوئے ہونٹ بصارتیں ہوئے
جبر کی آنکھ لگ گئی، سایۂ اختیار میں

رنگ بحال ہو گئے گال گلال ہو گئے
پھول سکوت کے کِھلے دامنِ آبشار میں

رات ہوا پلٹ گئی، گردِ لباس چھٹ گئی
دشت کی وسعتیں ملیں، وادیٔ سایہ دار میں

پتّیاں کانپتی رہیں سُرخیاں ڈھانپتی رہیں
لالۂ دشت کھل گیا، محبسِ نو ہسار میں

اَے سحرِ فراق، کیوں؟ ایک یہی مذاق کیوں؟
موجِ ملال کِس لیے رودِ نگاہِ یار میں

رات نواگری بھی کی، صُبح گداگری بھی کی
خالدِ نکتہ سنج نے شہرِ ہنر شکار میں

خالد احمد

غزل

ہے ادھر پھر وہی شب خوں کا ارادہ برلاس
اور ادھر مشغلۂ بربط و بادہ برلاس

پہلے بھی ایسی ہی شب تھی کہ قیامت ٹوٹی
پھر وہی رت وہی منزل وہی جادہ برلاس

کیا اثر اس پہ ہو اعجازِ مسیحائی کا
جس کے جینے کا نہ ہو اپنا ارادہ برلاس

اپنے ملبوس دریدہ کو چھپانے کے لیے
پہنے پھرتے ہو تصنع کا لبادہ برلاس

جن کو قربان کریں شاہ بچانے کے لیے
ہم ہیں اس بازی میں یوں جیسے پیادہ برلاس

تنگ دل تنگ نظر لاکھ ہوں دنیا والے
تم رکھو دامن دل اپنا کشادہ برلاس

ایسی بستی کو زمیں چاٹ لیا کرتی ہے
ظلم بڑھ جائے جہاں حد سے زیادہ برلاس

مرتضیٰ برلاس

غزل

حکمتِ حرفِ مکافات سمجھ آ گئی نا
کیا ہے کس کی یہاں اوقات سمجھ آ گئی نا

یہ بھی سورج کی کڑی دھوپ کا احساں جانو
رات کس کی تھی کہاں گھات سمجھ آ گئی نا

تیری اکھڑی ہوئی چالیں کہ عدو کا کس بل
کیا ہوا موجبِ شہ مات سمجھ آ گئی نا

اک زمانے میں ستمگر کی طرف سے کیوں تھی
لطف و اکرام کی بہتات سمجھ آ گئی نا

تجھ پہ بھی گزرے ہیں دو پل جو زمانے کی طرح
سختیِ صورتِ حالات سمجھ آ گئی نا

کیسے کرتی ہے گھنے پیڑ کو ویراں پت جھڑ
ساتھ رہتا نہیں اک پات سمجھ آ گئی نا

تجھے سمجھانا کسی کے لیے آساں کب تھا
سب یہ کس کی ہے کرامات سمجھ آ گئی نا

رنگ گریے کے ہیں کیا کیا مگر اک جہتِ دگر
یہ جو اندر ہوئی برسات، سمجھ آ گئی نا

خود بخود کھلتا چلا جائے گا عالم عالی
تجھ کو کچھ اپنی اگر ذات سمجھ آ گئی نا

جلیل عالی

غزلیں

دل فراغت کا زمانہ مانگے
عشق کرنے کا بہانہ مانگے

شہرِ وحشت سے نکل کر مجنوں
پھر وہی زخم پرانا مانگے

زربکف گل کی ہوس ہے دل میں
کون قاروں سے خزانہ مانگے

طائرِ غم ہے قفس میں تنہا
کوئی دل سوز ترانہ مانگے

میں کہ زندہ ہوں شبِ ہجر ابھی
تو مگر اور ٹھکانہ مانگے

میری بینائی سرِ دشتِ نوا
وہی نظارہ سہانا مانگے

یہ حقیقت ہے کہ ہر لمحہ حسن
زندگی تازہ فسانہ مانگے

حسن عسکری کاظمی

محرومیوں کا گرچہ خسارہ اٹھائیے
اس خطۂ زمیں کا مقدر بنائیے

جو حرفِ مدعا ہے بیاں کیجیے ضرور
انصاف کی طلب میں نہ سر کو جھکائیے

دعویٰ یہ ہے کہ سنگ پگھلتا ہے ہاتھ میں
کارِ ہنر کوئی تو یہاں بھی دکھائیے

کب گفتگو سے ظلمتِ شب میں کمی ہوئی
بہتر ہے اعتبار کی مشعل جلائیے

دیمک لگے شجر کی ہیں شاخیں تو بے ثمر
پھل چاہیے تو پھر نئے پودے لگائیے

گر تشنہ لب ہیں اسوۂ شبیرؑ پر چلیں
موقف درست ہے تو لہو میں نہائیے

رحم و کرم پہ غیروں کے رکھنا ہے گر حسن
بچوں کو جرأتوں کے نہ قصے سنائیے

غزل

غیب میں سے جھلک رہا ہوں مَیں
آدمی ہوں دمک رہا ہوں مَیں

دیدنی پار کر رہی ہے مجھے
کور چشمی کو ڈھک رہا ہوں مَیں

جانے یہ کیسی ناتوانی ہے
سانس لینے سے تھک رہا ہوں مَیں

اک طرف دل ہے، اک طرف دنیا
دونوں جانب کھسک رہا ہوں مَیں

بھر چکا ہوں میں اپنے اندر بھی
اس میں سے بھی چھلک رہا ہوں مَیں

ایسا لگتا ہے رات اس کے ساتھ
صبح ہونے تلک رہا ہوں مَیں

جیسے وہ ہم کلام ہو مجھ سے
بولتے میں اٹک رہا ہوں مَیں

ایک دن میں نے اس کو جھڑکا تھا
آج خود کو جھڑک رہا ہوں مَیں

کتنا عادی نشے کا ہو گیا ہوں
چائے پی کے بہک رہا ہوں مَیں

ایک کاغذ کا پھول ہوں محسن
اور پھر بھی مہک رہا ہوں میں

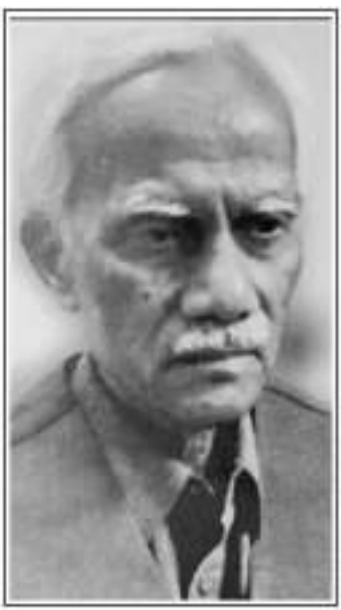

محسن اسرار

غزل

شان و شوکت، زور و زر سے ہیں مکدر آج بھی
اہل دل صدق و صفا سے ہیں منور آج بھی

فقر ہے صبر و رضا، فکر و نظر کا پاسباں
ارفع و اعلیٰ و یکتا ہے قلندر آج بھی

مدتوں کے ہم سفر کو راہبر نے کیا دیا
آبِ حیواں کو ترستا ہے سکندر آج بھی

کثرتِ اوہام سے بکھری ہوئی ہے کائنات
چشمِ بینا میں ہے اک قطرہ سمندر آج بھی

میں بھلا سکتا نہیں بھولے سے لمحہ ہجر کا
دیکھتی ہے چشمِ پرنم دل کے اندر آج بھی

ہر خدائی راز کا انسان ہے عقدہ کشا
عزم و ہمت سے کھلے گا ساتواں در آج بھی

قلب و جاں میں اب بھی اترا ہے وہ چہرا چاند سا
یاد ہے وہ روزنِ دیوار، وہ در آج بھی

حرفِ استفسار پر میرے وہ اس کا چونکنا
بھول پن کا یاد ہے دل کو وہ منظر آج بھی

عزم راسخ ہو تو ملتا ہے منازل کا نشاں
کوششِ پیہم سے دھلتے ہیں ولدر آج بھی

راستے اہلِ جنوں کے آج بھی مسدود ہیں
دستِ ناہنجار سے آتا ہے پتھر آج بھی

ناامیدی جذبۂ تعمیر کی توہین ہے
کامرانی ہے ریاض اپنا مقدر آج بھی

سید ریاض حسین زیدی

غزل

مجھ کو پناہ دے کے جو گیلا درخت ہے
اللہ کے کرم کا وسیلہ درخت ہے

لہجوں میں کاش ذائقہ اُس کا بھی آ سکے
جو میٹھی چھاؤں دیتا رسیلا درخت ہے

مَیں آدمی کے روپ میں ظاہر ہوا تو ہوں
لیکن در اصل میرا قبیلہ درخت ہے

کوئی وہاں پڑاؤ نہیں ڈالتا کبھی
موجود جس زمین پہ نیلا درخت ہے

اُس شاخِ گُل نے دیکھ کے بے ساختہ کہا
کیسا جوان، چھَیل چھبیلا درخت ہے!

بے حد قریب رات کی رانی کھِلی ہوئی
خوشبو میں مست مست، نشیلا درخت ہے

اِتنا غُبار پھیلا ہوا تھا فضاؤں میں
کچھ یوں لگا، وہ ریت کا ٹیلہ درخت ہے

میرے بدن کی کھال بھی اُس نے اُتار دی!
رندے سے جب کسی نے بھی چھیلا درخت ہے

وہ منتقل نہ سایہ نشینوں میں ہو کہیں!
جس زہر میں بُجھا ہوا نیلا درخت ہے

چڑیوں کے بولنے کی صدائیں تھیں وہ نسیم
اور مَیں سمجھ رہا تھا، سُریلا درخت ہے

نسیم سحر

غزل

ایسی قدیم آگ میں ڈالا گیا ہوں میں
محسوس ہو رہا ہے اُجالا گیا ہوں میں

ماحول ہے مرے لیے فردوس کی طرح
جس ڈھنگ کی فضاؤں میں پالا گیا ہوں میں

ماضی کی داستان بھلائی نہ جائے گی
باغِ جناں کے وعدے پہ ٹالا گیا ہوں میں

امکان ہے کہ مصر کی شاہی نصیب ہو
اجڑے ہوئے کنویں سے نکالا گیا ہوں میں

سنبھلا ہوں اس طرح سے کہ گرنا لگا مجھے
گرتے ہوئے لگا کہ سنبھالا گیا ہوں میں

لگنے لگی ہیں پست ہمالا کی چوٹیاں
اتنی بلندیوں پہ اُچھالا گیا ہوں میں

گلزار پانیوں میں خزانہ ضرور ہے
کیوں ورنہ بار بار کھنگالا گیا ہوں میں

گلزار بخاری

غزلیں

دن میں آرام مَیں نہیں کرتا
کچھ سرِ شام مَیں نہیں کرتا

کامیاب جنوں تبھی تو ہُوں
عقل کے کام مَیں نہیں کرتا

زندگی بھر کی دوستی کیجے
گام دو گام مَیں نہیں کرتا

گفتگو منتخب سے رکھتا ہُوں
جلسۂ عام مَیں نہیں کرتا

بحث و تمحیص آپ ہی جانیں
فالتو کام مَیں نہیں کرتا

خاور اعجاز

یونہی تو خواب نہیں ہر کسی دیوانے کا
خلد حصہ ہی نہ ہو نجد کے ویرانے کا

دوستوں سے ہی مجھے خدشہ ہے بہکانے کا
دشمنوں کے تو مَیں قابو میں نہیں آنے کا

گردشِ وقت ٹھہر جائے جو اِس پر رکھ دیں
ایک ٹکڑا مرے ٹوٹے ہُوئے پیمانے کا

سانس روکی ہُوئی ہے، بند ہیں آنکھیں میری
اور دعا گو ہُوں یہ حالات بدل جانے کا

مصحفِ دہر بڑے شوق سے کھولا تھا مگر
اِک ورق نکلا یہ قصہ مرے افسانے کا

غزل

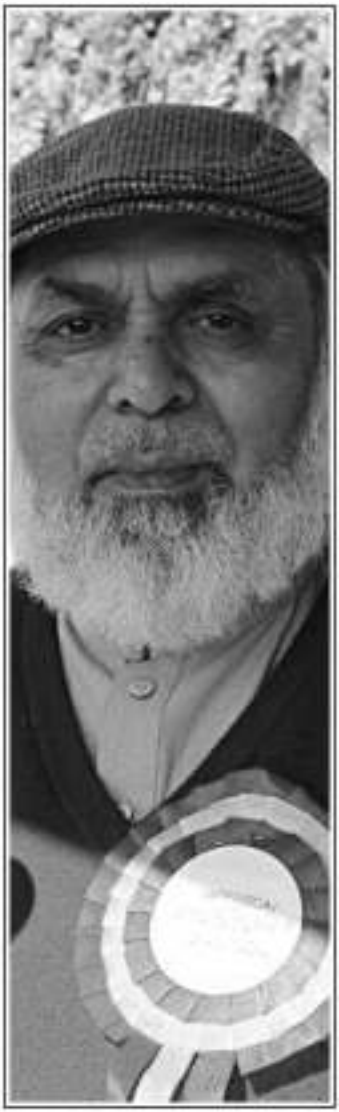

دھوپ نگری میں خنک چھاؤں بچھاتا میں ہوں
آنے والوں کے لیے پیڑ لگاتا میں ہوں

ننھے بچّوں کو قلم اور کتابیں دے کر
شہر میں علم کی آواز اُٹھاتا میں ہوں

روز سورج کو سمندر سے اُٹھا لاتا ہوں
روز اس طاق میں اک شمع جلاتا میں ہوں

شب گئے، گونجتی ہے میری اذاں کی آواز
اپنی سوئی ہوئی بستی کو جگاتا میں ہوں

روک کر بازوئے ہمّت سے نشے کا سیلاب
اپنے فردا کو اندھیروں سے بچاتا میں ہوں

پہلے بچّوں کو میں پاؤں پہ کھڑا کرتا ہوں
پھر بتدریج اُنھیں چلنا سکھاتا میں ہوں

پہلے تصویر بناتا ہوں تری جانِ انیس!
دیر تک پھر ترے چہرے سے ملاتا میں ہوں

محمد انیس انصاری

غزل

ہم فقیروں کا حال تو پوچھو
کوئی وجہِ زوال تو پوچھو

اپنی اپنی سنائے جاتے ہو
یار میرا خیال تو پوچھو

جس سے میں لاجواب ہو جاؤں
کوئی ایسا سوال تو پوچھو

آئنہ اپنے روبرو کر کے
آپ اپنی مثال تو پوچھو

جو بڑے باکمال بنتے ہیں
ان سے ان کا کمال تو پوچھو

جو لگاتے ہیں زخم ان سے ہی
زخم کا اندمال تو پوچھو

کھائے جاتے ہو جو بھی ملتا ہے
کچھ حرام و حلال تو پوچھو

کوئی عاشق ملے تو اس سے کبھی
عاشقی کا مآل تو پوچھو

تم کو معلوم ہے مگر باقی
تم کبھی میرا حال تو پوچھو

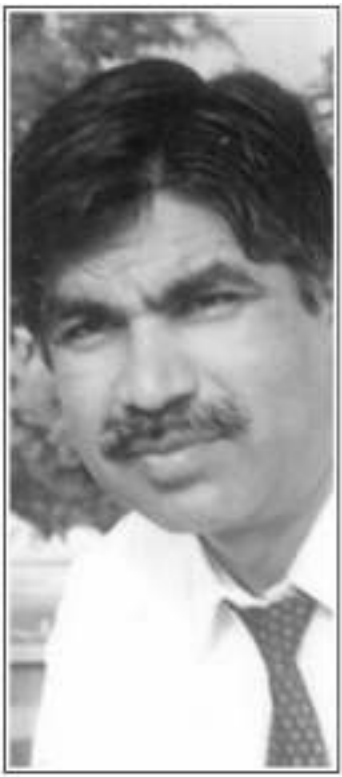

باقی احمد پوری

غزل

اک شہرِ نابکار میں ہیں ناصحاں بہت
تنہا زمین اُس پہ مگر آسماں بہت

یاں جان و دِل کا بچنا بہت ہی محال ہے
یہ کار زارِ عشق ہے اور ہے زیاں بہت

کیسے ہو داستان میں اپنا نشاں کوئی
اپنی رضا سے ہم ہوئے ہیں رایگاں بہت

اب کیا بتائیں ہم کہاں تھے دوسرے کہاں
اور کیوں لکھا ہے تذکرۂ دوستاں بہت

اس عارضی جہاں میں بنے کیسے مستقر
دِکھنے میں تو دراز ہے پر ہے کہاں بہت

احسان ، خالد اور سلیمی ، نجیب تھے
لاہور میں تھے عظمی مرے مہرباں بہت

اسلام عظمی

غزل

میں جو ذرا ہنس گا لیتا ہوں
اس دنیا کا کیا لیتا ہوں

پی کر تھوڑی دیر غموں سے
اپنی جان چھڑا لیتا ہوں

آئینے سے باتیں کر کے
دل اپنا بہلا لیتا ہوں

تنہائی میں بیٹھے بیٹھے
اپنے آپ کو پا لیتا ہوں

میں دانستہ بھی اپنوں سے
دھوکہ شوکا کھا لیتا ہوں

گر ہو اجازت تھوڑا تیرے
سائے میں سستا لیتا ہوں

کاٹے سے کٹتی نہیں راحت
جس شب خود کو آ لیتا ہوں

راحت سرحدی

غزل

ارادہ تو نہیں لیکن ارادہ ہو بھی سکتا ہے
سہولت ہے اگر تو استفادہ ہو بھی سکتا ہے

تحمل بردباری درگزر سب ٹھیک ہے لیکن
مرے اندر کہیں غصے کا مادہ ہو بھی سکتا ہے

ذرا سی دیر کو گھل کر ترے نمکین پیکر میں
فشارِ خوں۔ ضرورت سے زیادہ ہو بھی سکتا ہے

وہ گھوڑے اور ہاتھی کو بھی خاطر میں نہیں لاتا
کوئی شطرنج میں ایسا پیادہ ہو بھی سکتا ہے

ابھی ٹرخا رہا ہے سب کو ہی جھوٹی تسلی پر
کسی کے ساتھ تو پورا یہ وعدہ ہو بھی سکتا ہے

یہ اک دنیا ہی کیا اس میں کئی دنیائیں آ جائیں
فقط عاشق کا دل اتنا کشادہ ہو بھی سکتا ہے

جسے الجھا رہے ہیں آپ ان پر پیچ باتوں سے
کوئی حل مسئلے کا سیدھا سادہ ہو بھی سکتا ہے

بلا سے دوسروں کا جتنا بھی نقصان ہو جائے
مگر تھوڑا بہت اسکا افادہ ہو بھی سکتا ہے

یہ برگ و بار جھڑ سکتے ہیں سب پت جھڑ کے موسم میں
شجر کے تن پہ فطرت کا لبادہ ہو بھی سکتا ہے

یہ دل کا روگ دیمک کی طرح جس کو بھی لگ جائے
تناور پیڑ اندر سے برادہ ہو بھی سکتا ہے

مسعود احمد

غزل

انساں کا بدن تو زخمی ہوا، اِن خون سے تر زنجیروں میں
کیا روحِ بشر کو جکڑو گے، اے ظالمو اب زنجیروں میں

یہ کعبۂ جاں ہیں میرے لیے، میں اِن کے سہارے زندہ ہوں
اب یادِ جوانی باقی ہے، ماضی کی سبھی تصویروں میں

اب لوگ بپھر کر اُٹھے ہیں اور قصر سبھی مسمار ہوئے
سب اہلِ سیاست اُلجھے رہے، بے شرم دھیا تدبیروں میں

تقدیر کے قاضی کا فتویٰ، گو لوحِ ازل پر لکھا ہے
ہم نے تو ستارہ قسمت کا، دیکھا ہی نہیں تقدیروں میں

جو حرف لکھا وہ خوشبو تھا، جو بات بھی کی وہ شیریں تھی
اک عہد ہے میری شُعلہ نما تقریروں میں، تحریروں میں

وہ دور تو ایسے دور نہ تھے، جو دور کہ ہم نے دیکھے ہیں
کب نوکِ سناں پہ سر دیکھے، کب دیکھے بدن تھے تیروں میں؟

جب آپ بشر زندانی تھا، اب ذہنِ بشر زندانی ہے
جو جعفری تھے مردانِ وفا، وہ جکڑے گئے زنجیروں میں

مقصود جعفری

غزل

میرے بچے مرے عمار تک آ پہنچا ہے
ظلم آخر در و دیوار تک آ پہنچا ہے

یوں سمجھ لو کہ نکلنے کو ہے اک راہ عمل
درد میرا مرے اشعار تک آ پہنچا ہے

ہونے والی ہیں سبھی مشکلیں آساں اپنی
اک مسیحا ترے بیمار تک آ پہنچا ہے

اب چھپائے نہیں چھپتا ہے ترا قتل میاں
خوں بہا اب ترے کردار تک آ پہنچا ہے

اے مرے شہر کے وارث ترا اللہ حافظ
ہر لٹیرا ترے دربار تک آ پہنچا ہے

ہائے ہم لوگ کہ سولی پہ چڑھائے ہوئے لوگ
اور تماشہ ہے کہ بازار تک آ پہنچا ہے

کوئی محفوظ نہیں ان کی عناں گیری سے
سعد ظالم ہے کہ اخبار تک آ پہنچا ہے

سعد اللہ شاہ

غزل

اِس عہدِ کربلا کی نشانی خرید لو
بکتا لہو کے بھاؤ ہے پانی خرید لو

دوڑیں گی نَے کے گھونٹ سے رَگ رَگ میں بجلیاں
ہے بوتلوں میں بند جوانی خرید لو

لینا ہے جو بھی لیجیے ، بھاؤ نہ پوچھیے
ہر آن بڑھ رہی ہے گرانی ، خرید لو

سورج نے ڈوبتے ہوئے یہ کان میں کہا
تُم بھی تو کوئی شام سہانی خرید لو

گردہ بِکاؤ ، آنکھ کی پُتلی بِکاؤ ہے
چاہو تو میرے خوں کی روانی خرید لو

بکنے لگے غلام بھی روٹی کے نام پر
سستا مِلے گا یوسفِ ثانی خرید لو

حق سے متاعِ لوح و قلم چھیننے کے بعد
واعظ سے اس کی شعلہ بیانی خرید لو

آ جائے گا تمھارا بھی پھر شاعروں میں نام
گر تم عقیل غزلیں پرانی خرید لو

عقیل رحمانی

غزل

چین پانے میں دیر لگتی ہے
غم بُھلانے میں دیر لگتی ہے

دُکھ دیا ہے تو تھوڑا صبر بھی کر
مُسکرانے میں دیر لگتی ہے

لوگ جلدی میں سیکھنا چاہیں
گُر سکھانے میں دیر لگتی ہے

میرے گھر کے قریب گھر لے لو
آنے جانے میں دیر لگتی ہے

جب بھروسہ ہی انتہا کا ہو
آزمانے میں دیر لگتی ہے

ٹوٹنے کا پتا نہیں چلتا
شے بنانے میں دیر لگتی ہے

اتنا آسان بھی نہیں اقبال
گھر بسانے میں دیر لگتی ہے

اقبال سرو بہ

غزل

گلزار ، بن اداس ہے اک پھول کے بغیر
دل کی لگن اداس ہے اک پھول کے بغیر

رنگِ رخِ بہار اُسی کے سبب سے تھا
سارا چمن اداس ہے اک پھول کے بغیر

بادل کی اوٹ میں ہوا مہتابِ اشک بار
گویا گگن اداس ہے اک پھول کے بغیر

جس کو اجالے بُنتے تھے خاور کے نور سے
وہ پیرہن اداس ہے اک پھول کے بغیر

کیا رنگ سا اچھالتی تھی پتیوں کے بیچ
ننھی کرن اداس ہے اک پھول کے بغیر

آہنگ رنگ سارے رضاؔ ساتھ لے گیا
سازِ سخن اداس ہے اک پھول کے بغیر

رضا اللہ حیدر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

وہی بھائی ، وہی بھاؤ ، وہی قدریں خالد
کیا توقع کوئی لے کر سر بازار آئے

غزل

بات بڑھائی جا سکتی ہے
آنکھ ملائی جا سکتی ہے

سُر کو لے کے ساتھ ملا کر
تان لگائی جا سکتی ہے

دھند کے پار اُترنا ہے تو
آگ جلائی جا سکتی ہے

ہمسائے میں دستک سن کر
آس لگائی جا سکتی ہے

پانی تھوڑا مل جائے تو
روٹی کھائی جا سکتی ہے

منظر ظاہر ہو جانے تک
آنکھ لگائی جا سکتی ہے

وہ بھی تنہا ہو تو عاصمؔ
یہ تنہائی جا سکتی ہے

عاصم اعجاز

غزل

پہلے بات کو سمجھا کر
پھر خیرات کو سمجھا کر

ہنس کر ملنے والوں کی
ترجیحات کو سمجھا کر

تیرا بھلا ہی سوچوں گا
میری بات کو سمجھا کر

ان پڑھ بوڑھے لوگوں کی
تعلیمات کو سمجھا کر

معاملات سے پہلے تو
معمولات کو سمجھا کر

خیمہ نشیں کی آنکھوں سے
شش جہات کو سمجھا کر

کیسے صبح گزرتی ہے
تنہا رات کو سمجھا کر

کام نہیں ہے عجلت کا
پہلے نعت کو سمجھا کر

کیسا شکوہ یاروں سے
بس اوقات کو سمجھا کر

مٹی، پانی، آگ، ہوا
رب کی ذات کو سمجھا کر

میں فقدان سے واقف ہوں
تو بہتات کو سمجھا کر

از حد سے تو بے حد کی
تخلیقات کو سمجھا کر

ناممکن سے ممکن کے
امکانات کو سمجھا کر

دانش کٹتے پیڑوں کے
اک اک پات کو سمجھا کر

دانش عزیز

غزل

بتانا تھا جنھیں ان کو بتا کر میں نکل آیا
کئی ہنستے ہوئے چہرے رلا کر میں نکل آیا

وہ جس معصوم خواہش نے مجھے جینا سکھایا تھا
اسی معصوم خواہش کو دبا کر میں نکل آیا

میں جس کی مان جاتا تھا، جو رستا روک لیتی تھی
اسے بھی آج رستے سے ہٹا کر میں نکل آیا

کہاں ہے ناشتہ میرا؟ کدھر کپڑے گئے میرے؟
ابھی چائے بناؤ گی؟ نہا کر میں نکل آیا

کسی کا آج بھی میرے دماغ و دل پہ قبضہ ہے
کسی کے ہاتھ سے دامن چھڑا کر میں نکل آیا

جو اپنے ساتھ رہتا تھا، مری ہر بات سہتا تھا
اسے بھی گالیاں کافی سنا کر میں نکل آیا

تری بے مہر بستی سے، تری بے درد بستی سے
خدا کا شکر ہے بچے بچا کر میں نکل آیا

وہ جس بیکار نے مجھ کو ابھی نیچا دکھانا تھا
اسی بیکار کو نیچا دکھا کر میں نکل آیا

جنھیں تاریخ پڑھنی تھی، جنھیں تفسیر پڑھنی تھی
سبق ان کو محبت کے پڑھا کر میں نکل آیا

کسی دہلیز پر میں نے لگایا قہقہہ انصر
کسی دہلیز پر آنسو بہا کر میں نکل آیا

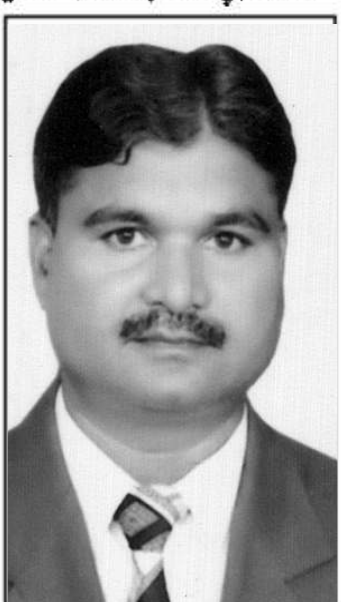

انصر حسن

غزلیں

ہم لوگ ندیدے ہیں شجر کاٹ رہے ہیں
جو صابر و شاکر ہیں ثمر کاٹ رہے ہیں

یوں دوسری چاہت کا ارادہ تو نہیں تھا
ہم پہلی محبت کا اثر کاٹ رہے ہیں

ہم کیسے بتائیں کہ ترے ہجر کا عرصہ
کٹتا بھی نہیں ہم سے مگر کاٹ رہے ہیں

پہلے تو یہ در بھی اسی دیوار سے نکلے
اب یوں ہے کہ دیوار کو در کاٹ رہے ہیں

اے کاش کوئی آ کے ہمیں یہ تو بتائے
ہم ڈوب رہے ہیں کہ بھنور کاٹ رہے ہیں

اک عمر سے ہم لوگ شجر کاٹ رہے تھے
اب ہم کوئی دن سے شجر کاٹ رہے ہیں

دراصل تو ہیں خیمۂ جاں کی یہ طنابیں
کہنے کو تمناؤں کا سر کاٹ رہے ہیں

جانا ہے کہاں، کون سی منزل ہے ہماری
معلوم نہیں اور سفر کاٹ رہے ہیں

جس دن سے ملاقات کو تم آئے ہو شاہد
ہم تیرے چلے جانے کا ڈر کاٹ رہے ہیں

افتخار شاہد

اگر وہ خواب کی سیڑھی اترنے لگ جائے
زمین زاد فرشتوں سے لڑنے لگ جائے

کبھی فلک کی بلندی کو غور سے دیکھو
زمین پیروں تلے سے پھسلنے لگ جائے

ثُو عشق زاد کی حالت پہ ہنسنے والا ہے
اگر یہ آگ ترے گھر میں لگنے لگ جائے

اگر وہ بننے سنورنے کا عزم کرتا ہے
یہ کائنات بھی ساری سنورنے لگ جائے

اگر وہ باغ میں آئے خرام کرنے کو
زمیں کی کوکھ ہر ارنگ اگلنے لگ جائے

اگر وہ حسن کی خیرات بانٹنے نکلے
ہماری آنکھ کا کاسہ چھلکنے لگ جائے

زمیں کی گردشِ لیل و نہار تھم جائے
اگر وہ ریشمی آنچل ڈھلکنے لگ جائے

غزلیں

شاخِ تن آپ کی بانہوں میں جو حائل ہوگی
ایک لمحے کو ہوا تک بھی نہ حائل ہوگی

دل کے جنگل کی طرف تیر بکف آئیں حضور
اور کیا ہوگا کوئی ہرنی ہی گھائل ہوگی

میں کہاں رقص میں ساکت ہے مرا پورا وجود
جو چھنگ اُٹھی ہے احساس کی پائل ہوگی

اک یہی سوچ کے گھر رکھ لیا تنہائی کو
یوں ہی در، در جو پھرے گی تو یہ زائل ہوگی

میں کہا کرتی تھی رخشندہ ترے بارے میں
تو نہ باتوں سے کسی بات پہ مائل ہوگی

رخشندہ نوید

اُٹھا کے طاق سے گل دان رکھ لیا گیا تھا
دوبارہ ملنے کا امکان رکھ لیا گیا تھا

وہ شیریں دودھ کی نہریں، وہ میٹھے میوہ جات
فلک پہ کچھ مرا سامان رکھ لیا گیا تھا

نظارے اور بھی دیکھے تھے، تیری صورت کو
نظر اُٹھانے کے دوران رکھ لیا گیا تھا

قدم قدم تھے مقامات حیرت و حسرت
سو، دل کو پہلو میں حیران رکھ لیا گیا تھا

قلم نے کتنے ہی ابواب کر دیئے ہیں تلف
تمھارا ذکر مری جان! رکھ لیا گیا تھا

غزل

کھٹک رہی ہے گھٹن کی یہ بُود و باش مجھے
پڑا ہوں میں کسی پتھر میں تُو تراش مجھے

ملائمت سے، نفاست سے چُھو مرا پیکر
اور ایسے چُھو کہ نہ آئے کوئی خراش مجھے

اِدھر اُدھر کے علاقوں میں ڈھونڈتا ہے کیا
میں تیرے دِل میں چُھپا ہُوں وہاں تلاش مجھے

سفید کانچ کے پُل پر پہنچ کے سوچتا ہُوں
مرا غرور ہی کر دے نہ پاش پاش مجھے

میں پُورے قد سے کھڑا ہوں سخن سرائے میں
لگے رہے ہیں گرانے میں بدمعاش مجھے

بدن میں خُون کی شاید کمی ہوئی پیدا
کہیں بھی سنگترے کی مِلی نہ قاش مجھے

جمال و حُسن کے پہلو کی دُھوپ ہے درکار
اے آفتابِ تمنّا نہ کر نِراش مجھے

آفتاب خان

غزل

کہاں سے آئے گا بانٹے جو غم ہمارے بھی
بھنور کی زد میں ہیں دریا بھی اور کنارے بھی

ضرورتوں سے نکل کر نہ دیکھ پائیں گے
زمیں پہ کوئی ستارے اگر اتارے بھی

بغیر بھیگے سمندر سے کوئی کب نکلا
کسے نصیب محبت ، بنا خسارے بھی

وہ جس کی بات بھی سر سے گزر ہی جاتی ہے
وہ چاہتا ہے کہ سمجھیں سبھی اشارے بھی

یہ شاعری ، یہ مرے خواب اور خیال ترا
دوام دے گئے یہ عارضی سہارے بھی

میں کیسے ڈال دوں دریا میں اپنی کشتی کو
کہ منزلوں کو پکاریں جہاں کنارے بھی

کسی وجود میں روشن میں ڈھل بھی سکتا ہوں
مجھے خیال سے باہر کوئی پکارے بھی

اعجاز روشن

غزل

ہر قدم دائرے سے باہر ہے
زندگی حوصلے سے باہر ہے

منزلیں ، منزلوں سے آگے ہیں
راستہ ، راستے سے باہر ہے

آب سے آئینہ ہے کب باہر
عکس بھی آئینے سے باہر ہے

دکھ نہیں ہے ، وہ اپنے آپ میں بھی
جو کسی سلسلے سے باہر ہے

اس قدر فاصلے پہ ہے انصاف
فیصلہ ، فیصلے سے باہر ہے

قافلے نے بھٹکنا ہے آخر
رہنما قافلے سے باہر ہے

ہم کہاں جا کے ڈھونڈیں شوکت کو
آج کل رابطے سے باہر ہے

افتخار شوکت

غزل

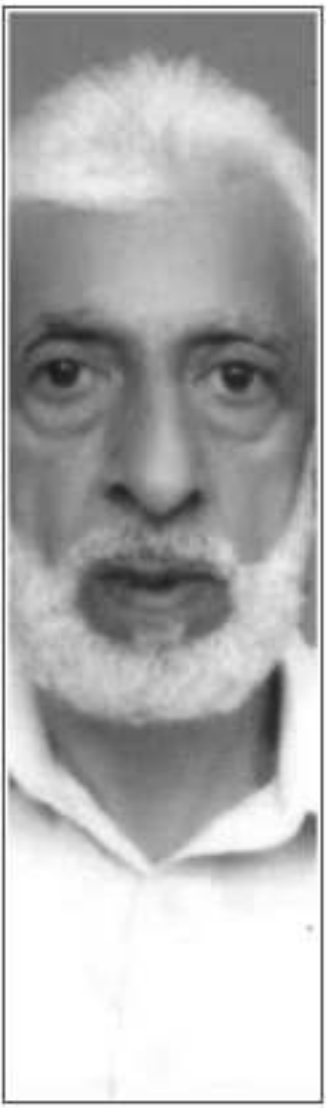

عکس ٹوٹے ہوئے دکھاتے ہیں
آئنے ہم پہ ظلم ڈھاتے ہیں

گھاس اُگتی نہیں جہاں یارو
ہم شگوفے وہاں کھلاتے ہیں

گھلنے لگتی ہے زندگی جن پہ
موت وادی میں لوٹ جاتے ہیں

ہر نظارہ حسین ہوتا ہے
مئے جب آنکھوں سے وہ پلاتے ہیں

وہ بدلتے ہیں وقت کا لکھا
جو دیے سے دیا جلاتے ہیں

آشنا ہیں جو غم کی لذّت سے
کب غموں سے وہ تلملاتے ہیں

جن کو عزّت اَنا کی پیاری ہے
وہ سمندر سے پیاس لاتے ہیں

وہ حسینی ہیں باخُدا شاہد
راہِ حق میں جو سر کٹاتے ہیں

ہمایوں پرویز شاہد

غزل

زبانِ حال سے اظہار کر دیا میں نے
خدا کا شکر کہ انکار کر دیا میں نے

مثالِ قطرۂ شبنم ، گداز لمحوں میں
لطیف رقص سرِ خار کر دیا میں نے

حیات بیت رہی تھی بڑی سہولت سے
یہ دیکھ کر اِسے دُشوار کر دیا میں نے

خبر سُنا کے سرِ انجمن مدینے کی
نظر نظر کو پُر انوار کر دیا میں نے

دل و دماغ میں یوں تو ٹھنی رہی پیہم
مگر ضمیر کو سرشار کر دیا میں نے

تم آنسوؤں سے ہمیشہ جو کام لیتے ہو
وہ کام صورتِ اشعار کر دیا میں نے

فنا بقا کے مزے لُوٹنے کے چکّر میں
انائے وہمی کو مسمار کر دیا میں نے

مرے غزال کے بچّے نے سیکھ لی تہذیب
سو دل کے دشت کو بازار کر دیا میں نے

مصاحبت میں نہیں غیر محرمی جائز
درِ خلوص کو دیوار کر دیا میں نے

چلو نہیں ہوں میں فیضان، بیدل و غالب
غزل کلام کو معیار کر دیا میں نے

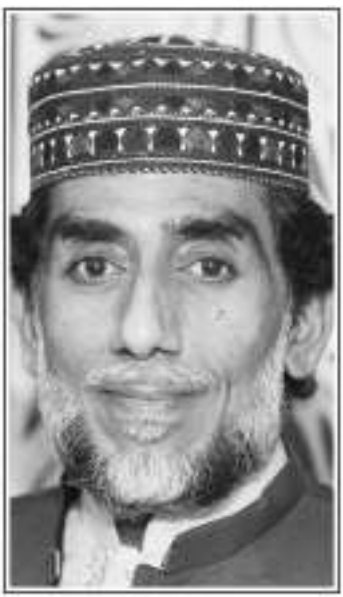

فیض رسول فیضان

غزل

یہ ایک پل جو ہمارا دکھائی دیتا ہے
یہاں بھی اس کا اجارا دکھائی دیتا ہے

یہ تنکا وقت کی لہروں میں گم نہ ہو جائے
ہمیں جو آج سہارا دکھائی دیتا ہے

وہ اپنی آنکھ میں پانی ضرور بھر لائیں
جنھیں دھوئیں کا اشارہ دکھائی دیتا ہے

ہم اس لیے بھی کواڑوں کو بند رکھتے ہیں
ذرا سی درز سے سارا دکھائی دیتا ہے

پڑا پڑا کسی دن سوکھ ہی نہ جائے کہیں
تغارچوں میں جو گارا دکھائی دیتا ہے

میں بامِ چشمِ تمنا سے کس طرح اتروں
یہاں سے گھر جو تمھارا دکھائی دیتا ہے

وہ خواب جس کو میں ہر بار رد کرتا ہوں
ہمیشہ مجھ کو دوبارہ دکھائی دیتا ہے

بس اب کی بار سمندر سے معذرت کر لوں
کبھی کبھی تو کنارا دکھائی دیتا ہے

اب اس کی رُوح کے اندر اتر کے کیا دیکھیں
یہی بہت ہے وہ پیارا دکھائی دیتا ہے

ہوائے شب نے اسے صرف چھو کے دیکھا تھا
چراغ صبح کا مارا دکھائی دیتا ہے

سیاہ شب ہے مگر یہ بھی کم نہیں طالب
فلک پہ ایک ستارا دکھائی دیتا ہے

طالب انصاری

غزل

لے ہم بھی آ گئے رسوائی تک ترے پیچھے
سہا ہے طعنۂ زیبائی تک ترے پیچھے

بس اک نظر ہی اُسے دیکھ آ سرِ بازار
کہ جس نے چھوڑ دی تنہائی تک ترے پیچھے

کسی طرح سے تو ڈھل جائیں خامشی میں تری
صدا لگائیں گے گویائی تک ترے پیچھے

تو جانتا نہیں سائے کی نفسیات ابھی
رہے گا لمحۂ یکجائی تک ترے پیچھے

سبک سری کی حسینہ ہی بس نہیں ہے سحرؔ
پڑی ہے دیر سے دانائی تک ترے پیچھے

حسنین سحرؔ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

آپ بھی دیں دامن کی ہوائیں
پھول کہاں تک آگ لگائیں

غزل

تری کشش کے کلیشے کو توڑنا پڑ جائے
زمیں پہ تازہ روایت کی ابتدا پڑ جائے

یہ لوگ دل سے نکلتے رہے تو ممکن ہے
خلا کا نام کسی روز انخلا پڑ جائے

زمیں پہ آدمی نایاب ہو نہ جائے کہیں
چراغ ہاتھ میں لے کر نہ گھومنا پڑ جائے

وہ کھو نہ جائے زمان و مکاں کی گلیوں میں
فلک کی چھت سے نہ اس کو پکارنا پڑ جائے

غبارِ غیب کو دیکھوں گا بند آنکھوں سے
کھلی رکھوں گا تو آنکھوں میں جانے کیا پڑ جائے

رکھا ہے اس لیے خود کو قریب فطرت کے
کہ تجھ سے دوری کی عادت نہ اے خدا پڑ جائے

سرائے شب میں نہ آئے کسی بدن پہ یہ وقت
کہ اُس کے سائے کو کھڑکی سے کودنا پڑ جائے

ہمارے خوف کا جنگل سے ہو گزر کسی رات
ہمارے خوف کے پیچھے کوئی بلا پڑ جائے

ہمارے شعلے پہ شعلہ گرے تو خیر ہے دوست!
ہمارے شعلے پہ چھینٹا نہ آپ کا پڑ جائے

بنا کے راہِ فرار اپنے پاس رکھ لی ہے
نہ جانے کون سی منزل سے بھاگنا پڑ جائے

کسی کے نام لکھیں زندگی کا آخری شعر
وہ شعر آخری لمحوں میں کاٹنا پڑ جائے

شاہد ماکلی

غزل

صحنِ افلاس میں جو پل کے بڑے ہوتے ہیں
صبر اور ضبط کے ہیروں سے جڑے ہوتے ہیں

منزلیں دور سے کرتی ہیں اِشارے اُن کو
عزم تولے کے جو راہوں میں کھڑے ہوتے ہیں

اِن میں منصور بھی کچھ ہوتے ہیں سقراط بھی کچھ
یہ جو کچھ لوگ سرِ راہ پڑے ہوتے ہیں

زندگانی کے کسی موڑ پہ مِل جاتے ہیں
عہدِ ماضی میں جو احباب لڑے ہوتے ہیں

مستقل سوچ کہاں ہوتی ہے ہر اِک کی ندیم
ہاں مگر بات پہ جو اپنی اَڑے ہوتے ہیں

ریاض ندیم نیازی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خالد وہ مجھے ہنسا ہنسا کر
کچھ اور اُداس کر گیا تھا

غزل

کس کو دیں دوش ، کیا کسی سے کہیں
چھن گئے ہوش ، کیا کسی سے کہیں

بے گناہی کا جب ثبوت نہیں
ہم ہیں نردوش ، کیا کسی سے کہیں

جس رخِ خوش جمال نے مارا
اب ہے روپوش کیا ، کسی سے کہیں

شکوۂ چشم بھی نہیں ہے روا
لب ہیں خاموش ، کیا کسی سے کہیں

کس نے جینا محال کر ڈالا
ہم ستم کوش کیا کسی سے کہیں

آنکھ کھلتے ہی ہم کو بخشی گئی
غم کی آغوش ، کیا کسی سے کہیں

عرض کرنا جو آ بھی جائے اگر
سب ہیں بن گوش ، کیا کسی سے کہیں

بارشِ التفات غیروں پر
ہم فراموش کیا کسی سے کہیں

کیسا نشہ تھا اس کی باتوں میں
ہم ہیں مدہوش ، کیا کسی سے کہیں

جن وکیلوں پہ تھا بھروسہ ہمیں
ہیں بلا نوش ، کیا کسی سے کہیں

ہم ہیں تیرا لباس اور تم نے
سمجھا پاپوش ، کیا کسی سے کہیں

خالدہ انور

غزلیں

اس نے تصویر بنائی میری
لکھ دیا ساتھ خدائی میری
میں تو دیتا رہا طوفاں کی خبر
کون سنتا تھا دہائی میری
تو بھی بیٹھا ہے مرے دوستوں میں
تو بھی کرتا ہے برائی میری
پہلے اس نے مجھے مٹی کا کیا
اور پھر خاک اڑائی میری
کارنس اس نے بھرا پھولوں سے
اور تصویر جلائی میری
ہوگیا دور وہ مجھ سے، اس کو
آگ لگتی ہے پرائی میری
میں نے ہر لفظ مجسم دیکھا
اس نے جب نظم سنائی میری
اس نے اوصاف عجب کام کیا
مجھ پہ دیوار گرائی میری

اوصاف شیخ

خوف ایسا ہے گھر نہیں سوتا
نیند آتی ہے پر نہیں سوتا
یہ تو اب ہجر ہے نا یہ بھی سہی
یوں بھی میں رات بھر نہیں سوتا
سو بھی جاؤں اگر سمٹ کر میں
میرے اطراف ڈر نہیں سوتا
چھوڑ دے میرے خواب میں آنا
ارے پاگل میں گھر نہیں سوتا
یوں بھی ہوتا ہے زندگی میں کبھی
رستہ سوئے، سفر نہیں سوتا
شہر کرتا ہے سائیں سائیں تو کیا
جانتا ہوں وہ در نہیں سوتا
جس کو ہو روگ جاگتا ہے دل
جو ہو شوریدہ سر نہیں سوتا
اک پرندہ بھٹک گیا اوصاف
اک شجر رات بھر نہیں سوتا

غزل

ہم نے جس دن سے محبت پہ نوازش نہیں کی
بس اُسی دن سے تخیل نے بھی گردش نہیں کی

دیکھیے آ کے مریضِ غمِ دل کی حالت
ہو گئی دیر مگر نبض نے جنبش نہیں کی

وہ بھی منہ موڑ گیا ملکِ عدم کی جانب
سب نے ہوتے ہوئے بیمار کی پرسش نہیں کی

سجدۂ عشق روا ہے جنہیں کرتے ہوں گے
ہم نے بس عشق نبھایا ہے پرستش نہیں کی

ضبط کے ایسے مراحل بھی گزارے ہم نے
اشک اندر کو گرے آنکھ سے بارش نہیں کی

کس عداوت کے سزاوار ہوئے ہیں ہم نے
جز محبت تو کسی چیز کی خواہش نہیں کی

مر گیا عابدی محرومِ تمنا ہو کر
تادمِ وقت کسی سے بھی گزارش نہیں کی

علی حسین عابدی

غزل

تمھاری رغبت، تمھاری آمادگی سے مل لوں
جو تم کہو تو تمھارے جیسے کسی سے مل لوں

سفر ہے درپیش پانیوں کا اے میرے صحرا
بہ شرطِ امکان کیا کسی جل پری سے مل لوں

میں چاہتا ہوں مرا بھی ہو غم گسار کوئی
ترے بھروسے کا ہے کوئی تو اسی سے مل لوں

نہ جانے کس کس کو چھوڑنا، روندنا پڑے گا
تو کیوں نہ پہلے ہی اپنے اس آخری سے مل لوں

محال لگتا ہے تیرے نعم البدل سے ملنا
تو کیا یہ بہتر نہیں دوبارہ تجھی سے مل لوں

مجھے ہے جس چیز کی کمی تو بھی جانتا ہے
گراں نہ گزرے تجھے تو میں اس "کمی" سے مل لوں

یہ کیا کہ اک بیوفا کو اپنا سمجھتے رہنا
سو کیا برا ہے جواب کسی اجنبی سے مل لوں

سخن کے جنگل کو کاٹ کر راستہ بناؤ
مرا بھی دل ہے کہ جیتے جی شاعری سے مل لوں

رانا غلام محی الدین

غزل

جو کام تیرے فدا کار کرنا چاہتے ہیں
وہ میرے گھر ہی میں دیوار کرنا چاہتے ہیں

خبر نہیں کہ کہاں وہ فریب دے جائے
وہ جس کو قافلہ سالار کرنا چاہتے ہیں

دِکھائی دے جہاں ہر عکس، عکس کے برعکس
وہ ایسا آئنہ تیّار کرنا چاہتے ہیں

خبر نہیں کہ کہاں وہ فریب دے جائے
وہ جس کو قافلہ سالار کرنا چاہتے ہیں

یہ اُن کا مسئلہ ہے گو کہ یہ بھی جانتے ہیں
کہ جو بھی کام ہے بے کار کرنا چاہتے ہیں

وہ چاہتے ہیں چلی جائے رونقِ بازار
سو، ہم بھی دشت کو بازار کرنا چاہتے ہیں

یہ ایک دو ہیں جو اپنے نئے اُصولوں سے
تمام شہر کو عیّار کرنا چاہتے ہیں

نبیلؔ شہر کے فتنہ گروں سے بچ کے چلو
یہ لوگ مجھ کو خطا کار کرنا چاہتے ہیں

سو، چاہیے کہ ذرا خود بھی جائزہ لے لیں
اگر خبر کو وہ اخبار کرنا چاہتے ہیں

یہ اُن کا شیوۂ فکر و عمل بھی کیا ہے عجب
کریم کو بھی ستم گار کرنا چاہتے ہیں

یہ بات اُن کو یونہی تو سمجھ نہ آئے گی
سو، ہم قلم کو ہی تلوار کرنا چاہتے ہیں

نہ جانے ڈھائے گا کیا کیا قیامتیں وہ شخص
وہ جس کو صاحبِ کردار کرنا چاہتے ہیں

نبیل احمد نبیل

غزلیں

مدھم سی روشنی میں مرے ساتھ کون ہے
مشکل کی اس گھڑی میں مرے ساتھ کون ہے

قدموں کی چاپ اور یہ سایہ سا کس کا ہے
آخر تری گلی میں مرے ساتھ کون ہے

تنہائیوں کا شکوہ تو پہلے بھی تھا مجھے
یوں بھی نئی صدی میں مرے ساتھ کون ہے

آیا ہے کس کا ہاتھ بہاؤ میں میرے ہاتھ
اس تیز روندی میں مرے ساتھ کون ہے

یہ کون آ گیا ہے برابر میں بھیگنے
اشکوں کی اس جھڑی میں مرے ساتھ کون ہے

کل تک جو میرے ساتھ تھے سب تیرے ساتھ ہیں
اب تجھ سے دشمنی میں مرے ساتھ کون ہے

جھینگر بھی بول بول کے خاموش ہو چکے
پھر ایسی خامشی میں مرے ساتھ کون ہے

اظہر عباس

اس نے کہا کہ زندگی، میں نے کہا کہ جھوٹ ہے
ہوتی ہے اس سے روشنی، میں نے کہا کہ جھوٹ ہے
آنکھوں میں نم لیے ہوئے کہنے لگی کہ میرے بعد
ڈھونڈو گے تم بھی دوسری، میں نے کہا کہ جھوٹ ہے
مجھ کو بنا کے آئینہ، پوچھا تھا اس نے بس یوں ہی
لگتی نہیں ہوں میں پری، میں نے کہا کہ جھوٹ ہے
مجھ سے ادائے ناز نے جب بھی کہا جہان میں
تم ہی ہو سب سے قیمتی، میں نے کہا کہ جھوٹ ہے
اس نے کہا کہ دیکھیے شہر ستم گراں کے بیچ
ہوگا کوئی تو آدمی میں نے کہا کہ جھوٹ ہے
دے کے فریب عشق میں، اس نے کہا ہمارے بیچ
یوں ہی رہے گی دوستی، میں نے کہا کہ جھوٹ ہے
اس نے کہا کہ آج بھی ہنستے ہو بات بات پر
ویسے ہی ہو شرارتی، میں نے کہا کہ جھوٹ ہے
اس نے کہا کہ ایک روز زینہ بہ زینہ زم بہ زم
اترے گی گھر میں چاندنی، میں نے کہا کہ جھوٹ ہے
اس نے کہا کہ عشق ہو، میں نے کہا کہ ٹھیک ہے
اس نے کہا کہ دل لگی، میں نے کہا کہ جھوٹ ہے

غزل

بس لرزہ بر اندام ہیں مسمار نہیں ہیں
دیکھو یہ مری خواہشیں بیکار نہیں ہیں

ہیں تنگیٔ حالات کے اسباب کئی اور
درکار مجھے درہم و دینار نہیں ہیں

تم کیسے مسیحا ہو تمہیں یہ بھی نہیں علم
سب لوگ یہاں آئنہ بردار نہیں ہیں

ہم ظلم کی چکی میں پسے جاتے ہیں چپ چاپ
اس کا ہے سبب اور ، اداکار نہیں ہیں

ہو جس کی تمنا کا سفر دستِ طلب تک
ہم ایسے کسی بت کے پرستار نہیں ہیں

نعیم رضا بھٹی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اک قہقہہ کام کر گیا تھا
ہر شخص بہ چشمِ تر گیا تھا

غزل

میں ان سے ہوں اور مجھ سے یہ بیزار ہیں سارے
رستے جو میسر ہیں وہ دشوار ہیں سارے

اس شہر میں اک میں ہوں گنہگارِ محبت
باقی تو مکیں صاحبِ دستار ہیں سارے

دو چار ہیں جو مجھ کو سمجھتے ہیں، میں ان کو
احباب نہیں باعثِ آزار ہیں سارے

دل گوہرِ نایاب کی وقعت نہیں کوئی
جسموں کے یہاں لوگ طلبگار ہیں سارے

پڑتی ہے ضرورت تو صدا دیتے ہیں مجھ کو
حیرت ہے مرے دوست بھی مکّار ہیں سارے

دشمن کے اشارے پہ جو گھر اپنا جلائیں
کم ظرف ہیں اس دیس کے غدار ہیں سارے

اک روز ملیحہ یہ مجھے قتل کریں گے
جو گھات لگائے پسِ دیوار ہیں سارے

ملیحہ سیّد

غزل

دوستی پر جو شاعری ہے دوست!
یہ بھی اِک رنگِ دوستی ہے دوست!

تُو کِسی گاؤں میں پلا بڑھا ہے
تیرے لہجے میں سادگی ہے دوست!

اپنی تعریف خُود ہی کرتے ہو
یہ تو اِحساسِ کمتری ہے دوست!

پھر مِلیں گے کِسی زمانے میں
کب مُلاقات آخری ہے دوست؟

اب مُجھے سب دِکھائی دیتا ہے
اب تِری یاد روشنی ہے دوست!

تُجھ کو دیکھا تو جان پایا ہوں
دیکھنے کی الگ خُوشی ہے دوست!

اِس میں ہر غَم سمائے گا کیفی!
دِل کی دُنیا بہت بڑی ہے دوست!

محمود کیفی

غزل

دشتِ بلا میں سایۂ دیوار ڈھونڈ کر
پچھتا رہے ہیں مونس و غمخوار ڈھونڈ کر

جن کی خود اپنی کوئی بھی قیمت نہ لگ سکی
اب لا رہے ہیں میرے خریدار ڈھونڈ کر

میں بھی عجیب ہوں کہ مسیحائی بھول کر
خوش ہو رہا ہوں جان کا آزار ڈھونڈ کر

دنیا میں کج کلاہوں کا شیوہ یہی رہا
تہمت لگائیں صاحبِ کردار ڈھونڈ کر

اس کو فقیہہِ شہر کے فتوے نے آ لیا
ہم لائے تھے جو لائقِ دستار ڈھونڈ کر

جن کی قبا سے داغ پرانے نہ ڈھل سکے
بیٹھے ہوئے ہیں پھر نیا غدار ڈھونڈ کر

کیا شہر میں خوشی کا علاقہ نہیں رہا
لاؤ کہیں سے کوئی تو سرشار ڈھونڈ کر

فیصل زمان چشتی یہ قحط الرجال ہے
تم اپنے جیسے لاؤ نا دو چار ڈھونڈ کر

فیصل زمان چشتی

غزل

پاس آتا وہ خوش آثار نظر آنے لگا
دور تک راستہ ہموار نظر آنے لگا

ایسے تقویمِ مہ و سال پہ کرنیں بکھریں
ایک لمحہ ابد آثار نظر آنے لگا

امرِ مانع نہ رہی اس کی طبیعت کی حیا
اور پھر رونقِ بازار نظر آنے لگا

بارِ الزام اٹھا لیتا تھا میری خاطر
اب کے اپنا ہی طرفدار نظر آنے لگا

سامنے پھیلے مناظر کی کشش جاتی رہی
جب مکمل پسِ دیوار نظر آنے لگا

میں نے جب کر لیا تلوار کو پابندِ نیام
ہر کوئی برسرِ پیکار نظر آنے لگا

جھوٹ کے تار سے جب اس نے کہانی بن لی
خود بھی الجھا ہوا کردار نظر آنے لگا

اس طرح رنگ حقیقت کا کھلا ہے جاذبؔ
شہر کا شہر اداکار نظر آنے لگا

اکرم جاذب

غزل

پھول سارے کھلا دیئے مُجھ میں
رَنگ سارے بَسا دیئے مُجھ میں

پیاس میری تھی چند قطروں کی
اُس نے دریا بہا دیئے مجھ میں

میں تھا ویراں سرائے اور اُس نے
چاند چہرے بسا دیئے مجھ میں

میں تو بے نَخل اور بَنجر تھا
پُھول اُس نے کھلا دیئے مُجھ میں

رات کالی تھی ، سَہل ، تھا ، پہ ، سَفر
اُس نے جُگنو چُھپا دیئے مُجھ میں

حُکم سَجدہ تو استعارہ تھا
اُس نے سَجدے چُھپا دیئے مُجھ میں

یہ مُحبت کا اُس کی ہے اعجاز
سوئے جَذبے جگا دیئے مُجھ میں

اجمل اعجاز

غزل

خود کو ہم دنیا میں بے کار لیے پھرتے ہیں
پھر بھی سو طرح کے اسرار لیے پھرتے ہیں

لوگ سچ کہہ نہیں سکتے ہیں زباں سے اپنی
سر پہ ہر جھوٹ کا طومار لیے پھرتے ہیں

مال بک سکنے کی جھوٹی سی تسلی بھی نہیں
لوگ ساتھ اپنے خریدار لیے پھرتے ہیں

ذہن سے یاد اترتی ہی نہیں ہے اس کی
ہم وہ کوچہ، وہی بازار لیے پھرتے ہیں

میں نے دیکھا، سبھی خبریں ہیں پرانی اس میں
آپ کل کا کوئی اخبار لیے پھرتے ہیں

درج کروا تو چکے ہیں سبھی اقرار اپنا
آپ لب پر وہی انکار لیے پھرتے ہیں

کیا بگاڑے گی بھلا دھوپ جہاں میں ان کا
ساتھ جو سایۂ دیوار لیے پھرتے ہیں

دل پہ کیا زخم ہیں، جو اس سے نہیں لگتے ہیں
ہونٹ پر لوگ وہ گفتار لیے پھرتے ہیں

جینا مشکل تو بنا ڈالا گیا ہے انجم
زیست جیسی بھی ہے دشوار لیے پھرتے ہیں

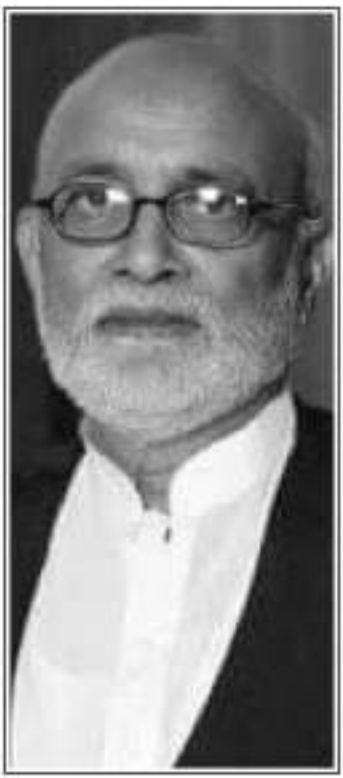

محمد افضال انجم

غزل

ستائشوں پہ گزارا ہے کیا کیا جائے
نہ سود ہے نہ خسارا ہے کیا کیا جائے

نہ کوئی نقش ہے چاہت کا اس کی آنکھوں میں
نہ اس نے دل سے اتارا ہے کیا کیا جائے

نہ اس کا لہجہ ہے شیریں نہ لب پہ ہے مسکان
نہ اس نے خود کو سنوارا ہے کیا کیا جائے

کرو نہ بات مگر روبرو تو بیٹھے رہو
مجھے تو یہ بھی گوارا ہے کیا کیا جائے

یہ بازی عشق کی ہے اس کے ہیں الگ دستور
وہ جیت کر بھی تو ہارا ہے کیا کیا جائے

کسی جگہ سے پرندے تمام اُڑ جائیں
یہ آفتوں کا اشارا ہے کیا کیا جائے

میں تیرگی کے تعاقب میں بھاگتا سورج
کہ روشنی نے پکارا ہے کیا کیا جائے

مرا اثاثہ ہے اشفاقؔ اشک اور آہیں
سو جو بھی ہے وہ تمھارا ہے کیا کیا جائے

محمد اشفاق بیگ

غزل

''سلسلے تو سبھی سے ہوتے ہیں'' وقت آخر گزر ہی جاتا ہے
خواب بس زندگی سے ہوتے ہیں دکھ تو وابستگی سے ہوتے ہیں

تم نے سمجھا ہے غیر اچھا ہے تم نے چھوڑا کہ میں نے چھوڑا ہے
رشتے کب ہر کسی سے ہوتے ہیں فیصلے کچھ خوشی سے ہوتے ہیں

کیا کہا ہم بھی بھول جائیں گے کاش کچھ تم نے بھی کہا ہوتا
کام بس یہ تہی سے ہوتے ہیں فاصلے ان کہی سے ہوتے ہیں

اشک آنکھوں میں آ گئے ہیں کیوں
رابطے دل لگی سے ہوتے ہیں

نائلہ راٹھور

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پریشاں رو ، کسی پہلو نہیں تھا
ترا غم موجۂ خوشبو نہیں تھا

غزل

زبیر خیالی

وہ اضطراب کا منظر عجیب لگتا ہے
پرندہ قید کے اندر عجیب لگتا ہے

اگلنے لگتا ہے ساحل پہ شام کو سب کچھ
اسی ادا پہ سمندر عجیب لگتا ہے

عجب نہیں جو کفایت شعار ہو مفلس
بخیل ہو جو تونگر عجیب لگتا ہے

جنوں پہ عقل کو دیتا ہے جب کوئی سبقت
وہ فہمِ خام کا پیکر عجیب لگتا ہے

نہیں ہے آپ سے میرا موازنہ کوئی
بشر خدا کے برابر عجیب لگتا ہے

ذرا بھی تجھ سے توقع نہیں مجھے جس کی
وہ لفظ تیری زباں پر عجیب لگتا ہے

تمھارے ساتھ تو اک عمر کے مراسم تھے
تمھارے ہاتھ میں خنجر عجیب لگتا ہے

کیا ہے دل نے خیالی مشاہدہ اکثر
بشر بساط سے باہر عجیب لگتا ہے

غزلیں

رات کا ڈر مٹا دیا میں نے
خواب دیکھا بھلا دیا میں نے

تیری مٹھی میں ریت دیکھی تو
خود کو صحرا بنا دیا میں نے

اک سمندر جو میرے اندر تھا
آنسوؤں میں بہا دیا میں نے

ایک چھوٹی سی جیت کے بدلے
اپنا سب کچھ گنوا دیا میں نے

تیرے جانے کے بعد ہاتھوں میں
جو بھی آیا گرا دیا میں نے

اک شکاری نے پوچھا جنگل کا
اس کو خود سے ملا دیا میں نے

عمران اعوان

یہی تو سوچ کے ہلکان تھا میں سارا دن
کہ میرے بعد بھی کٹتا رہا تمہارا دن

مجھے پتہ ہے ترا فلسفہ ضرورت ہے
اسی لیے تو مرے بعد بھی گزارا دن

ہم آج شام سے پہلے نہ لوٹ پائیں گے
کہاں یہ لمبا سفر اور کہاں ہمارا دن

ہم اہلِ ہجر ہیں راتوں کو جاگنے والے
ہمارے واسطے تو نے نہیں اتارا دن

ہمیں بھی وصل کے لمحے عزیز ہیں جاناں
ہمیں بھی زندگی سے دے کوئی ادھارا دن

حسین لگنے لگی ہے تمام دنیا مجھے
تمہاری آنکھ نے ایسے مرا سنوارا دن

غزل

حیرت زدہ ہیں کرچیاں اشکوں میں ڈھال کے
تھکنے لگے ہیں؛ درد بھی لفظوں میں پال کے

بجھتے ہوئے چراغ میں ایسا تھا طنطنہ
ہم سے ملے تھے خواب بھی نظریں سنبھال کے

عمرِ رواں کی ماندگی تقسیم ہو گئی
دو چار دن ہی یاد ہیں ہر ماہ و سال کے

تجھ سے وفائے عہد کا منشا نہ ہو سکا
انداز سارے تجھ میں ہیں بس بھیڑ چال کے

ایسی سپردگی کہاں خود کے بھی ہو سکیں
خدشے امنڈ رہے ہیں ابھی احتمال کے

خواہش کے مردہ جسم کو دفنائیں گے کہاں
ٹکڑے سنبھالنے پڑے جو اس ملال کے

ہجر و وصال کی تو کوئی بات بھی نہیں
صدمات ڈھانپتے ہیں ابھی اندمال کے

سعدیہ بشیر

غزلیں

حالتِ رنج میں کیا دھیان تمہارا کرتے
ہم اگر سانس بھی لیتے تو خسارا کرتے

جن کے سانسوں کی روانی ہی جڑی تھی تم سے
کس طرح یاد سے تیری وہ کنارہ کرتے

یوں اندھیروں کے تصرف میں نہ آتے ہم لوگ
تم اگر خاک کے ذروں کو ستارہ کرتے

چل پڑا ہوتا کسی آنکھ میں ٹھہرا دریا
آپ منظر کو اگر ایک اشارہ کرتے

تیری رسوائی کا گر خوف نہ ہوتا ہم کو
ہم ترا نام ہی ہر وقت پکارا کرتے

رخسانہ سمن

مرا خیال کسی رنگ و رس میں آ جاتا ؟
جو اڑ رہا تھا پرندہ قفس میں آ جاتا ؟

ہر ایک چیز مرے اختیار میں ہوتی
اگر وہ شخص مری دسترس میں آ جاتا

تری زبان سے ہوتا اگر ادا ، سچ میں
جو پیار، عشق ہے وہ بھی ہوس میں آ جاتا

ہمیں رکھا نہیں جاتا اگر ترے اندر
ترا وجود ہمارے نفس میں آ جاتا

مرے شریر سے دنیا نچوڑ دیتی اسے
سمن اگر وہ کسی ایک نس میں آ جاتا

غزل

شام ڈھلے جب رختِ سفر کو ہم نے اونٹ پہ بار کیا
اک تارے نے ریگستان میں راستے کو ہموار کیا

نیر بہاتی سَسّی نے جب پُنّل کو آوازیں دیں
ڈار سے بچھڑی کونج نے تب آواز کو اُس دم پار کیا

جیون کاٹتے آ گئے ہیں ہم بچپن سے اپنے بڑھاپے تک
وقت کی دو دھاری تلوار نے دیکھو کیسا وار کیا

کام کی بابت پوچھے ہو تو کیا تم کو بتلائیں ہم
قاصر* کی دھرتی والے ہیں ہم نے تو بس پیار کیا

ہم دریا کی مستی لے کر اپنی دُھن میں کھوئے ہیں
ہم کو تو معلوم نہیں ہے کب کس نے بیزار کیا

لہروں کی رقّاص طبیعت کشتی کے ہمراہ رہی
ملاحوں نے گیت سنا کر سندھو دریا پار کیا

زاہد خان

*غلام محمد قاصر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

لڑکھڑا کر دم نہ دے دیں ڈگمگاتی دوریاں
دل میں بجھتی لو کی صورت کپکپاتی دوریاں

غزل

وہ جو دریا تھا وہ دریا تھا نہیں
خیر اچھا ہے میں پیاسا تھا نہیں

اس میں جو ڈوبا وہ پھر ابھرا کہاں
ظاہراً پانی جو گہرا تھا نہیں

خیرگی کا اک بہانہ تھا فقط
جو اجالا تھا ، اجالا تھا نہیں

شہر میں ہر سمت پھیلے تھے سراب
کوئی جیسا تھا ، وہ ویسا تھا نہیں

وہ جو میرا تھا نہیں ، میرا تھا وہ
وہ جو میرا تھا ، وہ میرا تھا نہیں

دوستوں کو بھی کوئی پرخاش تھی
پہلے ان کا یہ رویہ تھا نہیں

یاد آئے ٹوٹ کر اپنے وہاں
وہ جہاں کوئی پرایا تھا نہیں

در حقیقت تھا غبار کارواں
وہ جو گریہ تھا ، وہ گریہ تھا نہیں

میں کہ در آیا تھا اک دیوار سے
مڑ کے جب دیکھا تو رستہ تھا نہیں

دشمنوں کو یہ غلط فہمی رہی
در حقیقت میں اکیلا تھا نہیں

حادثوں ہی سے کھلا مجھ پہ خدا
وہ ہوا اکثر جو سوچا تھا نہیں

اک بغاوت تھی مسلسل دم بہ دم
سانس کا نوحہ بھی نوحہ تھا نہیں

جسم پر پہرے تھے سو پہرے رہے
سوچ پر تو کوئی پہرا تھا نہیں

در حقیقت جو عقیدہ تھا مرا
کیا کہوں میرا عقیدہ تھا نہیں

سارے سچے مقتلوں میں جا بسے
شہر میں اب کوئی سچا تھا نہیں

جان دے کر ہم اماں میں آگئے
اس سے بہتر کوئی جزیہ تھا نہیں

مدتوں جس کو تراشا خواب میں
خواب سے باہر وہ چہرہ تھا نہیں

علمدار حسین

غزلیں

ہمارے حجرے میں مخفی نعمت چراغ کی ہے
وہ اس لئے ہے کہ اب ضرورت چراغ کی ہے

اگر ہو ممکن ، جدھر بھی موقع ملے سمیٹو
جہاں میں سب سے زیادہ برکت چراغ کی ہے

ازل سے دیکھا ہر اک زمان و مکان اس نے
جُدا زمانے میں یوں بصارت چراغ کی ہے

میں گہرے جنگل کی وحشتوں سے اگر بچا ہوں
یقین کیجے یہ ساری ہمت چراغ کی ہے

منا رہا ہوں بہت عقیدت سے آج گھر میں
خوشی سے رقصاں ہوں کہ ولادت چراغ کی ہے

مرے قبیلے نے روشنی سے وفا سمیٹی
سو میرے ذمہ فقط حفاظت چراغ کی ہے

بپھرتے طوفان میں بھی جلتا رہا ہے شب بھر
ہوا کے چہرے پہ کیسی ہیبت چراغ کی ہے

دیے کی لو کا ہر ایک لب پہ جو تذکرہ ہے
مری سمجھ میں تو یہ بھی نصرت چراغ کی ہے

ہر ایک گھر میں ہر ایک چہرے پہ روشنی ہو
ازل سے جامی یہی وصیت چراغ کی ہے

مستحسن جامی

رہ لوں گا بھلے دُنیا میں خشکی ہو تری ہو
بس یہ نہیں چاہوں گا مجھے تیری کمی ہو

جتنا بھی مناسب ہو، اُسے اور ہوا دے
وہ شخص جسے آگ محبت کی لگی ہو

ہر پھول ترنم بھری آغوش سے نکلے
تتلی کے لبوں پر کوئی موہوم ہنسی ہو

ہر وقت ہر اک سانس مرے حجرۂ جاں میں
اک تُو ہو، محبت ہو، تری جلوہ گری ہو

آواز دلِ زرد سے آتی ہی رہے گی
شاید تجھے ادراک محبت کا کبھی ہو

اقدار کی تدفین کسی طور نہ کرنا
زندہ ہے وہی شئے جو روایت سے جُڑی ہو

دُنیا کے فسادات کا کیا خوف ہے جامی
جب مرشدِ کامل ترا حق باھُو سخی ہو

غزل

ایک جھرنا، ایک دریا، اک سمندر دل میں ہے
خواب آگیں اس نگر کا اک کھلا در دل میں ہے

جھلملاتے تاروں سے لپٹی ہوئی لیلائے شب
جانے کب سے اس طرح کا ایک پیکر دل میں ہے

نیلگوں سی جھیل میں نیلا ہے عکسِ آسماں
ایک منظر آنکھ میں ہے ایک منظر دل میں ہے

حادثے اتنے ہوئے محسوس کچھ ہوتا نہیں
ایسے لگتا ہے کہ جیسے سنگِ مرمر دل میں ہے

اُلجھنیں، اندیشے، خدشے، وسوسے ہیں اس قدر
دل ضرور اک اور اس دل کے برابر دل میں ہے

ایک حُسنِ بے کراں ہے، اک ادائے بے بہا
اک تصور، ہر تصور سے جو برتر، دل میں ہے

دل گیا پر آپ دل سے جا نہ پائیں گے کبھی
یادِ ماضی، فکرِ فردا سے بھی بڑھ کر دل میں ہے

راجہ عبدالقیوم

غزل

جاں پہ بن آئی نہ جاں جانے کا اندیشہ ہے
پھر بھی اِس دل کو مرے کون سا اندیشہ ہے

میں ترے خواب میں آنے کا بھروسہ تو کروں
پر مری آنکھ میں اک جاگتا اندیشہ ہے

ایسی تقلید کہ اندھی بھی ہو لاچار بھی ہو
ایسی تقلید میں کب بولتا اندیشہ ہے

گل کے رخسار کو شبنم ہے گراں بار، یہاں
شاخِ ریحان سے لپٹا ہوا اندیشہ ہے

اب ہے آبادی میں آرام نہ ویرانے میں چین
دل کو لاحق مرے پھر اک نیا اندیشہ ہے

عادل اِن خانہ بدوشوں کی مسافت کے لیے
صبح ایقانِ طرب رتجگا اندیشہ ہے

عزیز عادل

غزل

اُس کے آنسو مجھ میں ایسے گرتے ہیں
وقت کی شاخ سے جیسے لمحے گرتے ہیں

نظروں سے تُم گر کر شاید جانو گے!!
اونچائی سے یکدم کیسے گرتے ہیں

ٹوٹے بکھرے خواب سنبھالوں کب تک میں؟
میری جیب سے اکثر سکّے گرتے ہیں

صحن کی خاطر اپنا حصہ دے آیا
دولت پر تو ایسے ویسے گرتے ہیں

دل گٹھڑی میں وعدے سب سے نیچے باندھ
دل ٹوٹے تو پہلے وعدے گرتے ہیں

دل میں بابر شام خزاں کی ٹھہری ہے
صحنِ جاں میں پیلے پتے گرتے ہیں

احمد سجاد بابر

غزل

کھو گیا آشیاں ہتھیلی پر
یہ جہاں اب کہاں ہتھیلی پر

زندگی اک چراغ لائی تھی
بن گیا کارواں ہتھیلی پر

چھو لیا جب گداز ہاتھوں نے
سج گئی کہکشاں ہتھیلی پر

بیچنے کو بکو گئے ہم بھی
مالِ دل کی دکاں ہتھیلی پر

دیکھئے معجزے محبت کے
بولتی ہے زباں ہتھیلی پر

جل گیا آتشِ جنوں سے بدن
اُٹھ رہا ہے دھواں ہتھیلی پر

زندگی کھیل ہے نصیبوں کا
لکھ گیا رازداں ہتھیلی پر

لیجئے داغ بھی جدائی کا
دھر گیا مہرباں ہتھیلی پر

ہم تو بس نام کے سکندر ہیں
قسمتیں اب کہاں ہتھیلی پر

مرزا سکندر بیگ

غزلیں

گلگشت کو شمشان کیا اور چلی وہ
جاتے ہوئے دکھ دان کیا اور چلی وہ

اس نے یہ ریاست دلِ درویش کو سونپی
سینہ مرا ملتان کیا اور چلی وہ

حوا سے بھی پہلے مری دمساز تھی کوئی
اک دن مرا اُپمان کیا اور چلی وہ

وہ جس کی توجہ مجھے بارش کی طرح تھی
الٹا مرا گلدان کیا اور چلی وہ

ہم سانپ تھے اور خوف تھا میراث ہماری
اس نے اسے گنجان کیا اور چلی وہ

عقیل عباس

امورِ سلطنتِ جسم کا سیانا تھا
سو میرا رات کی رانی سے دوستانہ تھا

پھر ایک دن مجھے معبد کی سیڑھیوں پہ ملا
وہ اولین فرشتہ جو مارا جانا تھا

سفر نکل گئے ہم کو وگرنہ ہم نے بھی
کہیں پہنچ کے کسی کو گلے لگانا تھا

کلاس روم میں اتنا سے نہیں ہوتا
یہ سانحہ تمہیں گھر سے بنا کے لانا تھا

ابھی ابھی جو ہمارے دلوں سے گزرا ہے
تمہیں خبر نہیں شاید مگر زمانہ تھا

غزل

جیسے جیسے زندگی کی آگہی بڑھتی گئی
اس جہانِ کُن میں میری بے بسی بڑھتی گئی

دسترس میں آئے ہم تو پھڑ پھڑائے تھے بہت
دسترس بڑھتی گئی آمادگی بڑھتی گئی

آرزو نے ہاتھ سے اس زور سے پکڑا مجھے
ہوش سب رخصت ہوئے اور بے خودی بڑھتی گئی

رات بھر پہلو سے میرے لگ کے وہ سویا رہا
زندگی کے غم سے میری دوستی بڑھتی گئی

میر و غالب کا سخن اب طاقِ نسیاں ہو چکا
شاعری رخصت ہوئی اور نغمگی بڑھتی گئی

دھیرے دھیرے چاند نکلا بدلیوں کی اوٹ سے
جیسے جیسے زلف سلجھی، روشنی بڑھتی گئی

ملتے ملتے زندگی سے ہم وہیں پر آ گئے
جس قدر قربت بڑھی، بیگانگی بڑھتی گئی

عشق کا آغاز تھا، وہ شام سی آنکھیں، مگر
رابطے بڑھتے گئے اور شاعری بڑھتی گئی

ذات کی خوشبو الگ اور بات کی خوشبو الگ
عمر سے وہ ساتھ تھی پر تازگی بڑھتی گئی

میں نے سب وہ جھاڑ دی جتنی زمیں کی گرد تھی
پھر خلاؤں کی طرف یہ زندگی بڑھتی گئی

شہر سے وہ جب گیا تو حبس کچھ اتنا بڑھا
بارشیں برسی بہت اور پھر نمی بڑھتی گئی

جیسے جیسے زندگی نے ہاتھ کو جھٹکا حبیب
اس کو چھونے کی تڑپ، دیوانگی بڑھتی گئی

بشیر احمد حبیب

غزل

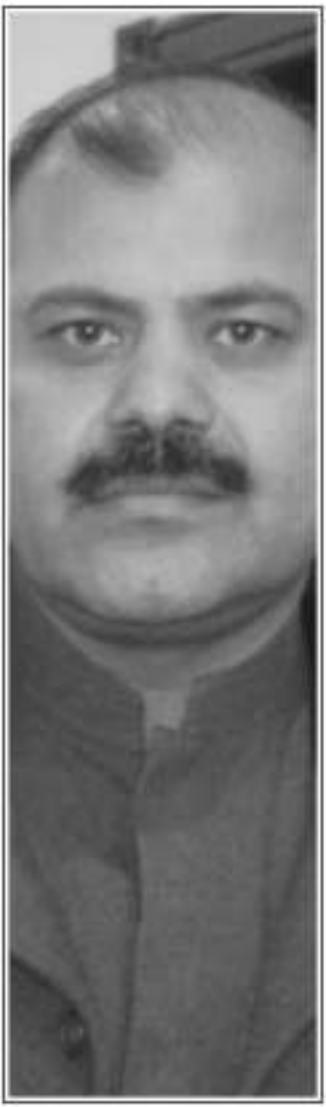

یہ مصیبت گزیدہ رات ہٹا
میری قسمت سے اب تو مات ہٹا

بوجھ بڑھنے لگا مرے دل پر
اے محبت تجاوزات ہٹا

دیکھنے دے مجھے بھی دنیا کو
میری آنکھوں سے اپنے ہاتھ ہٹا

چاہتوں پر اگر یقیں ہے تجھے
تو محبت سے ذات پات ہٹا

یہ تکلف مجھے قبول نہیں
دوستی سے تکلفات ہٹا

اپنی آنکھوں کو میرے ہونٹوں سے
ہولے ہولے بہ احتیاط ہٹا

ماند پڑنے لگا ہے صبر و سکوں
گنبدِ دل سے خواہشات ہٹا

تیری قربت مری دوا شاہد
کیمیائی مرکبات ہٹا

شاہد فرید

غزل

کس قدر ہے وہ قیمتی تصویر
کاش یہ بات جانتی تصویر

ایک تصویر ہے حقیقت میں
ایک اس کی علامتی تصویر

اپنی آنکھوں پہ مر گئی ہو گی
اپنی تصویر دیکھتی تصویر

تم نے دیکھی ہے بولنے والی
میں نے دیکھی ہے کانپتی تصویر

اس کے ہونٹوں پہ ہاتھ رکھنا پڑا
اس سے پہلے کہ بولتی تصویر

صرف پلکوں کے ہی اشاروں سے
میری ہر بات ٹالتی تصویر

اس کے ماتھے کو چومتا ہوا میں
مسکرا کر وہ جاگتی تصویر

چور نظروں سے دیکھنا اس کا
پھر دوپٹہ سنبھالتی تصویر

لکھنؤ کی وہ لگ رہی ہے صغیرؔ
صرف آنکھوں سے بولتی تصویر

صغیر احمد صغیر

غزل

ہوائے تند نے کھولا جو در حویلی کا
زمیں پہ گر پڑا بوڑھا شجر حویلی کا

وہ گنگناتی ہوائیں ، وہ شور چڑیوں کا
کہیں میں کھو سا گیا سوچ کر حویلی کا

مری حویلی کے لوگوں سے ایسی نسبت تھی
بچھڑ کے بھی میں رہا عمر بھر حویلی کا

صدا لگاتی ہے پختہ گھروں کی تنہائی
کہ دور آئے گا بارِ دگر حویلی کا

خدائے ارض وسما ! ہم پہ رحم فرما دے
کوئی بھی شخص نہ ہو دربدر حویلی کا

ہوئی ظہور صدا لا الٰہ الا اللہ
سماں بدل گیا وقتِ سحر حویلی کا

ہر ایک ذرہ گواہی یہ دے رہا ہے ظہورؔ
کبھی بھی ختم نہ ہو گا سفر حویلی کا

ظہور چوہان

غزلیں

روشنی دے کر نئی آنکھیں مِلیں
کیا گنوا کر یہ بھلی آنکھیں مِلیں

دیکھنے کا شوق مہنگا پڑ گیا
چھن گئی مٹنے لگی، آنکھیں مِلیں

خیر سے لوٹے! چلو اچھا ہوا
راستے میں کیا مری آنکھیں مِلیں

سردیوں کی دھوپ جیسی مہرباں
کب ہمیں ایسی کوئی آنکھیں مِلیں

دیکھنا اُن کا کہ جیسے بولنا
کل ہمیں کچھ بولتی آنکھیں مِلیں

اپنا چہرہ آپ کو کیسا لگا
آپ سے جب آپ کی آنکھیں مِلیں

صبح دم یہ بدشگونی، خیر ہو!
خواب میں ٹوٹی ہوئی آنکھیں مِلیں

فرح رضوی

خود اپنے گرد بنایا حصار ٹوٹ گیا
وہ بھیڑ تھی کہ مرا ہاتھ مجھ سے چھوٹ گیا

ٹٹولیے تو بدن بھی سراغ دیتا ہے
کہاں تلک کوئی پندارِ ذات ٹوٹ گیا

ہتھیلیوں کی لکیریں رگڑ کے دیکھتے ہیں
کہ ان پہ لکھی جدائی کا رنگ چھوٹ گیا

بہت رکھی تھی محبت کی لاج سوہنی نے
پھر ایک رات نصیبا گھڑے کا پھوٹ گیا

درِ سوال پہ تنہا کبھی نہیں پہنچے
گئے تو ساتھ ہمارے بھرم کا جھوٹ گیا

یہ اپنے پن کا اُجالا تو ماند پڑنے لگا
بُرا ہوا کہ تکلف کا داغ چھوٹ گیا

غزلیں

تنہائی کا ڈر نہیں جاتا
جان نہ چھوڑیں دل کی جھیلے
اس لئے اب میں گھر نہیں جاتا
جب تک انساں مر نہیں جاتا

سوچ میں تیری مری بسی ہے
جب وہ رو کے ہُوا تھا رخصت
ذہن سے میرے تھر نہیں جاتا
ذہن سے وہ منظر نہیں جاتا

جب تک چھلکے باہر نہ پانی
کیسے افضل شاد رہے دل
جب تک برتن بھر نہیں جاتا
سجدے میں جب سر نہیں جاتا

کارجنوں میں دشت کو جائے
رستہ کوئی گھر نہیں جاتا

افضل ہزاروی

ایسا بھی اک منظر دیکھا
گھائل ہم نے پتھر دیکھا

دریاؤں میں آب کا فقداں
اور کھیتوں کو بنجر دیکھا

کون یہ موج سپرد ہوا ہے
غمگیں آج سمندر دیکھا

رہنے لگا تعبیر کا دھڑکا
جب سے خواب میں خنجر دیکھا

کب آرام کا طالب تھا دل
کب آنکھوں نے بستر دیکھا

شام ہوئی بے تاب ہوئے ہم
افضل یہ بھی اکثر دیکھا

غزلیں

چاند جب چھت سے دیکھتا ہے مجھے
چشمِ حیرت سے دیکھتا ہے مجھے

آدمی ہوں بھٹک بھی سکتا ہوں
وہ محبت سے دیکھتا ہے مجھے

دل کی حالت عجیب حالت ہے
اب اجازت سے دیکھتا ہے مجھے

اپنی دھرتی کو بیچنے والا
کس رعونت سے دیکھتا ہے مجھے

کوئی آٹوگراف لیتے ہوئے
کتنی حسرت سے دیکھتا ہے مجھے

کیسے پیچھے پلٹ گیا تھا میں
وقت حیرت سے دیکھتا ہے مجھے

کون ہے ، جانتا نہیں راولؔ
وہ جو عزت سے دیکھتا ہے مجھے

راول حسین

کر سجدہ کوئی ایسا زمیں بول پڑے
حاضر ہے خدا دل میں جبیں بول پڑے

تنہا جو پکاروں میں کبھی دل میں اسے
فوراً ہی مرے دل کا مکیں بول پڑے

ہر درد ہی چپکے سے سہے جاتا ہے دل
کعبے کا خدا دل میں کہیں بول پڑے

نگری سے محمد کی تو چمٹا رہے بس
ممکن ہے کہ رب مجھ سے یقیں بول پڑے

جب حشر بپا ہو تو شفاعت کے لئے
تو پاس ہے امجد یہ امیں بول پڑے

امجد ہزاروی

غزل

اچھے الفاظ میں اغلاط پر تنقید ممکن ہے
گھٹے ماحول کی اخلاص سے تمہید ممکن ہے

نہ تدبیریں نہ تقدیریں ہمارے ہاتھ میں صاحب
تمھی بتلاؤ ایسے میں کوئی تجوید ممکن ہے

یہاں ہر رات اس اُمید پر برسوں گزاری ہے
کہ کل نکلے ہمارے نام کا خورشید ممکن ہے

میں جب بھی دیکھتی ہوں زندگی کو چشمِ حیراں سے
مجھے محسوس ہوتا ہے خُدا کی دید ممکن ہے

پڑھے لکھوں کو دیکھیں مسندوں کا سودا کرتے ہیں
جہالت کی کسی بھی شکل میں تقلید ممکن ہے

اگر ہو شکر کا جذبہ ، خدا پر ہو یقیں کامل
ردا پھر مفلسی کے درمیاں بھی عید ممکن ہے

ردا حاصل خلوص

غزلیں

کہیں صحرا ، کہیں دریا ہمارا
کہیں محلوں سے بڑھ کر ہے ہمیں تو

یہ کس کے ہاتھ ہے نقشہ ہمارا
تمہارے قرب میں خیمہ ہمارا

رہے قائم سدا خوشبو تمہاری!
نگہ ہے کامیابی پر تمہاری

ہمارے ہاتھ گلدستہ ہمارا
ہُوا ہے خرچ بھی کتنا ہمارا

نظر آیا نہیں کچھ بھی نیا پن
قمر، فرقت میں تیری کھو گیا ہے

جو آیا ہے وہی دیکھا ہمارا
کہیں پھولوں بھرا بستہ ہمارا

کسی کے اشک کام آئے وگرنہ
بڑا ویران تھا رقبہ ہمارا

ذرا بد دل نہیں ہونا ہے ہم نے
ملے گا ایک دن حصہ ہمارا

قمر نیاز

میں کیا بتاؤں، یا اخی! نگر نگر اداس ہے
کوئی خوشی بھی باعثِ سکوں نہیں رہی مجھے

ترے بغیر کائنات کا سفر اداس ہے
تمہارے ہجر میں صنم دل اس قدر اداس ہے

مرے حساب سے اسے تو حق نہیں ہے جینے کا
تمہاری زلفِ عنبریں مقام ہے گلاب کا

کوئی اگر تمہارے ہونٹ چوم کر اداس ہے
میں کیا کروں گلاب میرے ہاتھ پر اداس ہے

ہمارے ساتھ ساتھ کرتی ہے سفر تمہاری یاد
تمہاری سحر آفرینی ہے حویلی پر قمر

چلو ہماری خیر ہے پہ ہمسفر اداس ہے
نظر اٹھائیے حضور بام و در اداس ہے

کوئی طرب کا انتظام لازمی ہے کبریا!
ترا خلیفہ، یا خدا! زمین پر اداس ہے

بصارتوں کے واسطے ہے مسئلہ بنا ہُوا
میں کیا کروں یہ رونقیں وہ خوش نظر اداس ہے

غزل

ظلمت شب کے مٹانے کو سحر کافی ہے
ساتھ تم بھی چلو ہمدم کہ سفر کافی ہے

خاک کر دے گی یہ ہیبت سے تجھے پل بھر میں
خون میں ڈوبی ہوئی ایک نظر کافی ہے

وقت کی دھوپ کے رستے کی رکاوٹ ہوگا
دشت کی آگ میں بس ایک شجر کافی ہے

مجھ پہ پتھر نہ اٹھا ، تُو تو گنہگار نہ ہو
سنگ باری کے لئے تیرا نگر کافی ہے

اتنا ناراض ہے کیوں؟ مجھ سے پریشان نہ ہو
میری رسوائی کو اک بدلی نظر کافی ہے

میرے خالق نے جو رکھا ہے تجھے آسودہ
میرے جینے کے لئے اتنی خبر کافی ہے

خالق آرزو

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

گُم راہ بھی ہم کبھی رہے ہیں
اس فخر میں کچھ عجب نشے ہیں

غزل

نگاہِ ناز کی بے پردگی میں رکھے تھے
تمھارے خواب کسی پوٹلی میں رکھے تھے

تُو ہی بتا دے خدایا گزر گئے ہیں کہاں؟
وصال لمحے جو ساکت گھڑی میں رکھے تھے

اسی لیے تو وہ چُندھیا رہے تھے آنکھوں کو
جلا کے میں نے دیے روشنی میں رکھے تھے

تمام شعر مرے لفظ لفظ جھڑتے رہے
عجیب مصرعے مری شاعری میں رکھے تھے

اب اُن کی راکھ پڑی ہے ہمارے سر میں عظیمؔ
جو خط کسی نے جلا کے گلی میں رکھے تھے

فخر عظیم

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کوئی مجھے سنوار رہا ہے تراش کر
پتھر کے پاس تیشہ بکف کون آ گیا

غزل

گلزارِ دل مہک اٹھا خوشبوئے سمن سے
سرشار ہوئی روح مری سیر چمن سے

آتا ہے مجھے راس فقط موسمِ الفت
بھرتے ہیں مرے زخم محبت کی پون سے

ہاتھوں میں بھرے کان لیے سوچ رہا ہوں
اب کون بچائے مجھے لفظوں کے دہن سے

اس واسطے آیا ہی نہیں پھول کھلانے
آتی ہے مہک خون کی اب تیرے چمن سے

اک خستہ مسافر تھا میں خوابوں کے نگر کا
تعبیر بنا لایا ہوں اک سیمیں بدن سے

نعمان محمود

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

آپ بھی دیں دامن کی ہوائیں
پھول کہاں تک آگ لگائیں

غزل

ہر طرف میرے خلا تھا اور آدھی رات تھی
مجھ کو اپنا سامنا تھا اور آدھی رات تھی

شہر والے سو رہے تھے ایک گہری نیند میں
شہر سارا جل رہا تھا اور آدھی رات تھی

تجھ سے ملنے کی تمنا، ہاتھ میں کافی کا مگ
سامنے اک آئنہ تھا اور آدھی رات تھی

میں نے دیکھا اپنے کمرے کا دریچہ کھول کر
چاند بادل میں چھپا تھا اور آدھی رات تھی

چائے خانہ، آتی جاتی گاڑیوں کا شور، ہم
زندگی پر تبصرہ تھا اور آدھی رات تھی

مہر علی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

بات سے بات نکلنے کے وسیلے نہ رہے
لب رسیلے نہ رہے، نین نشیلے نہ رہے

غزل

شوق اپنے بھی تو نرالے ہیں
آستینوں میں سانپ پالے ہیں

لوگ رکھتے ہیں آبلہ پائی
اپنی آنکھوں میں خواب چھالے ہیں

اک نئے غم کی پھر ضرورت ہے
غم پرانے تو دیکھے بھالے ہیں

اشک آہیں جنون ہجرو ملال
سب مری زیست کے حوالے ہیں

اب مجھے زندگی سے لگتے ہیں
زخم ہاتھوں پہ میں نے پالے ہیں

ضد پہ تھے اشک آنکھ سے نکلیں
منتیں کر کے میں نے ٹالے ہیں

تیری تصویر بن گئی کیسے
صرف کاغذ پہ رنگ ڈالے ہیں

کون آکر بسا ہے آنکھوں میں
کس کے ہونے سے یہ اجالے ہیں

مان جاتے ہیں اک دلاسے پر
درد بھی کتنے بھولے بھالے ہیں

زندگی کی سمجھ نہیں آئی
لاکھ لکھے گئے مقالے ہیں

انصر رشید انصر

غزل

جب تجھے غم کی معرفت نہیں ہے
جو بھی لکھتے رہو لکھت نہیں ہے

گفتگو صاف صاف کرتا ہوں
مجھے درپیش مصلحت نہیں ہے

خود کو اتنا بھی دربدر نہ سمجھ
تُو ابھی گردِ شش جہت نہیں ہے

پہلے میں بھی یہی سمجھتا تھا
صرف دنیا ہے آخرت نہیں ہے

عیب ہوں گے ہزار ہا، لیکن
مجھ میں طرزِ منافقت نہیں ہے

ماں پریشان ہو رہی ہوگی
کیوں بتایا کہ خیریت نہیں ہے

ہر جگہ بے سکون رہتا ہوں
کوئی گوشۂ عافیت نہیں ہے

ایک ناکام ہوں محبت میں
دوسرا دُکھ ملازمت نہیں ہے

اب کہ ایسے سفر سے لوٹا ہوں
بات کرنے کی بھی سکت نہیں ہے

پھر مصیبت نہ آ پڑے مجھ پر
میری تنخواہ سے بچت نہیں ہے

جان لینی ہے تو ابھی لے جا
دل مرے پاس معذرت نہیں ہے

ازور شیرازی

غزل

کسی کی سوچ کو محور بنایا جائے گا
پھر اس کے بعد اسے دل میں لایا جائے گا

بنایا جائے گا اس کو ضروری اپنے لیے
پھر اس کے بعد اسے بھی بھلایا جائے گا

اے کوزہ گر مجھے اتنا بتا دیا جائے
مرا خمیر کہاں سے اٹھایا جائے گا

شعور ذات سے آگے اگر میں بڑھ پایا
چراغ عشق بھی اک دن جلایا جائے گا

کیا گیا ہے یہ وعدہ بھی میرے ساتھ ایاز
کہ ایک دن مجھے خود سے ملایا جائے گا

محمد علی ایاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہر قدم خاک بہ سر، حشر بہ پا رہتے ہیں
ہم کہ چپ رہ کے بھی سرگرم نوا رہتے ہیں

غزلیں

محبت ہے، کسی کو کھو کے پانے کا گماں رہنا
وِصال و ہجر کی اِک کشمکش کے درمیاں رہنا

کہاں آتا ہے انسانوں کو یوں بھی مہرباں رہنا
محبت ہے، کسی کا زندگی بھر راز داں رہنا

کبھی رہنا ہو محوِ چہرۂ یاراں، محبت ہے
بڑی مدت تلک فرحت کا ویسا ہی سماں رہنا

محبت ہے کبھی ملنے میں ہونا معجزے پیہم
کبھی مجبوریوں کا راہ میں کوہِ گراں رہنا

محبت میں ابھی بھی سنتِ فرہاد باقی ہے؟
جو قلبِ یار سے نکلے تو دنیا میں کہاں رہنا؟

یہی کچھ کم نہیں اثباتِ عشقِ آسمانی کو
ہمیشہ سے زمیں کے واسطے یوں آسماں رہنا

ابوبکر المشرقی

ساحل سمندروں کی حفاظت پہ ڈٹ گئے
پھر اشک میری آنکھ کے اندر سمٹ گئے

میں بدنصیب شخص فقط منتظر رہا
حصے مرے کے ابر کہیں اور چھٹ گئے

مشکل سے ڈھونڈ لایا تھا اک چاند کی کرن
تارے حواس باختہ ہو کر پلٹ گئے

ہر سمت تیرگی ہے اجالوں کے باوجود
روشن تو ہیں چراغ مگر لو سے ہٹ گئے

شورِ جہاں میں ہم کو تری جستجو رہی
جس سے سنا تمہارا اسی سے لپٹ گئے

ہر درد کی دوا ہے مگر عشق کی نہیں
میں تھا اسیرِ عشق مرے نقش کٹ گئے

شفقت حسین شفق

غزل

ہے قریب الغرق ناؤ جاگتے رہنا
آب جو کے ناخداؤ جاگتے رہنا

نرخ ناموں کے سبب اٹھ بیٹھنے والو
آنے والا ہے چناؤ جاگتے رہنا

نیند کی پہلی ہے بری آج آنکھوں میں
وحشتو! گر جاگ پاؤ ، جاگتے رہنا

مر گیا ہے آخری جگنو بھی آنگن کا
ہو چکا ہوں بے الاؤ جاگتے رہنا

رتجگا منظوم کر کے رکھ چکا ہوں میں
جب کہا ہے کچھ سناؤ ، جاگتے رہنا

اب خلا بھی زلزلوں کی زد میں آئے گی
ہوں گے بے خوابی کٹاؤ ، جاگتے رہنا

کیا پتہ کس رخ پہ بہہ نکلے رکا ساگر
نہیں امکاں میں بہاؤ جاگتے رہنا

ساگر حضور پوری

بلّے صاحب زندہ ہیں احبابِ ادب کے دل دل میں

سیّد فخر الدین بلّے ۔ بڑے حلم و آبرو والے

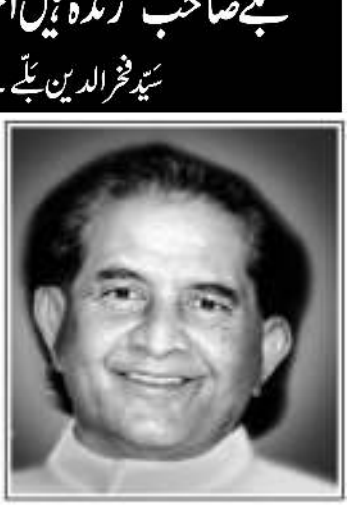

قدرت بعض لوگوں کو قلب و ذہن کی غیر معمولی صلاحیتیں ودیعت کر کے اس عرصہ گاہِ دہر میں بھیجتی ہے۔ ساتھ ہی انہیں ایک اور صلاحیت بھی عطا کرتی ہے اور وہ ہے اپنی تحلیلِ ذات سے بے نیاز ہو کر انسانیت اور انسانیت کی خدمت میں ہمہ تن منہمک رہنا۔ اس سے انہیں اپنی ذات کو پسِ پشت رکھ کر معاشرے کی خدمت کو اولیت دینی پڑتی ہے۔ نتیجہ یہ کہ وہ شہرت کی ان بلندیوں پر فائز نہیں ہو پاتے، جو ان کی صلاحیتوں کا تقاضا ہوتا ہے مگر وہ ان لوگوں کے دلوں میں زندہ رہتے ہیں، جن سے ان کا واسطہ پڑتا ہے۔ سیّد فخر الدین بلّے ایسی ہی شخصیات میں شامل تھے۔ وہ اگر اپنی علمی اور ادبی صلاحیتوں کی آبیاری میں کچھ زیادہ وقت صرف کرتے تو نامور ادیب اور منفرد شاعر ہوتے مگر انہوں نے سماج، قوم اور احباب کی خدمت کو ترجیح دی اور احباب ہی کے دلوں میں زندہ رہے۔

معروف انگریزی شاعر ٹامسن گرے نے اپنی مشہور نظم

Elegy Written in a Country Churchyard

کے ایک بند میں ایسے ہی افراد کے بارے میں لکھا ہے۔

Full many a gem of purest ray serene,

خواجہ محمد زکریا

The dark unfathomed caves of ocean bear: Full many a flower is born to blush unseen, And waste its sweetness on the desert air:

اسی خیال کو امیر مینائی (مرحوم) نے بڑی سادگی سے ذیل کے شعر میں یوں ادا کیا ہے

کون ویرانے میں دیکھے گا بہار؟
پھول جنگل میں کھلے کن کے لئے

.....

سیّد فخر الدین بلّے جنگل کے بجائے شہر میں کھلنے والے پھول کی طرح تھے اور شہر کے لوگ اتنے مصروف ہوتے ہیں کہ وہ روزانہ جن خوبصورت راستوں سے گزرتے ہیں، ان کے سبزہ وگل کی طرف نگاہِ غلط انداز کی فرصت بھی انہیں میسر نہیں ہوتی۔

ہوسکتا ہے میں بھی بلّے (مرحوم) کی شخصیتِ دل آرا و دلکش سے نا آشنا ہی رہتا مگر حسنِ اتفاق سے بیسویں صدی کی آخری دہائی کے چند برس میں نے ان کی ہمسائیگی میں گزارے۔ اس وجہ سے ان سے قرب کے مواقع میسر آئے اور ان کی وضع داری، شرافت، خوش مزاجی اور انسان دوستی کی خصوصیات کو قدرے قریب سے دیکھا۔

شادمان لاہور کے ایک سرکاری کوارٹر میں منتقل ہوا اور صدی کے اختتام تک وہیں رہا۔ سیّد فخر الدین بلّے جی او آر تھری میں میرے کوارٹر کے عین سامنے سکونت پذیر رہے۔ میرے کوارٹر اور ان کے سرکاری مکان کے بیچ میں صرف تیس فٹ کی ایک سڑک حائل تھی۔ میں نے اگرچہ ان کا نام پہلے سے سن رکھا تھا لیکن ملاقات سے محروم تھا۔ ایک روز ان کے فرزند ظفر معین بلّے تشریف لائے اور اپنے ہاں منعقد ہونے والی کسی ادبی تقریب میں شمولیت کی دعوت دی۔ بعد ازاں اس قبیل کی متعدد تقریبات میں حاضر ہونے کے مواقع ملے۔ اگرچہ 1990 سے 1999 کے درمیان میں نے پانچ سال بیرونِ پاکستان گزارے تاہم ان دو وقفوں کے باوجود بلّے صاحب کے ہاں درجنوں ادبی محفلوں میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔

یہ محفلیں بالعموم غیر رسمی ہوتی تھیں۔ حاضرین کی تعداد چالیس پچاس کے قریب ہوا کرتی تھی۔ شہر کے ممتاز شعرا اور ادبا باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے۔ شرکا میں حکومت پنجاب کے بڑے بڑے اہم بیورو کریٹ بھی شامل ہوتے، لیکن وہ اپنی ادبی اور شعری حیثیت کی بنا پر شرکت کرتے اور آدابِ محفل کا پوری طرح خیال رکھتے۔ ہر

ادب دوست اس بات سے شناسا ہے کہ بدقسمتی سے ادب میں بھی دیگر سماجی اداروں کی طرح گروہ بندیاں موجود ہیں۔ بعض اوقات نوبت مخالفانہ تحریروں تک پہنچ جاتی ہے اور ایسی تلخیاں جنم لیتی ہیں کہ باہمی روابط منقطع ہو جاتے ہیں اور یہ حضرات کسی محفل میں یکجا بیٹھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔ فخر الدین بلّے کی محفلوں میں ہر مزاج اور ہر خیال کے ادیبوں کو بلایا جاتا تھا اور مختلف الخیال شریک ہوتے تھے اور وقتی طور پر تلخیاں بھلا دیتے تھے۔ بلّے صاحب تمام ادیبوں کا یکساں احترام کرتے تھے۔ ان کے دروازے سب کے لیے کھلے تھے اور سب کو برابر اہمیت دیتے اور جس کسی نے بھی ادب کی خدمت کی ہے، اس کے وقار اور عزت کا پورا خیال رکھتے۔

ان کے ہاں منعقد ہونے والی ادبی محفلوں میں مشاعرے بھی ہوتے۔ ادبی اور تنقیدی مضامین بھی پڑھے جاتے۔ سوال و جواب بھی ہوتے۔ بذلہ سنجی اور ذکاوت کے مظاہرے بھی ہوا کرتے لیکن یہ محافل تلخیوں اور کدورتوں سے پاک ہوتیں۔ ہر محفل کے اختتام پر خورد و نوش کا انتظام ہوتا۔ یہ اہتمام بلّے صاحب اپنی جیب سے کرتے اور اشیائے خوردنی ان کی خواتینِ خانہ تیار کرتیں۔ اس طرح یہ دلچسپ محفلیں اختتام پذیر ہوتیں اور کسی آئندہ محفل کے انعقاد کا اشتیاق بڑھا دیتیں۔

سیّد فخر الدین بلّے محکمہ اطلاعات حکومتِ پنجاب میں اعلیٰ افسر تھے۔ ایک مستعد اور فرض شناس افسر ہونے کی وجہ سے اہلِ اقتدار سے ان کا قریبی رابطہ رہتا۔ مثلاً مجھے خوب یاد ہے کہ پنجاب کے درویش صفت وزیر اعلیٰ غلام حیدر وائیں ان کا بہت احترام کرتے اور ان کے مشوروں پر عمل کرتے۔ وائیں صاحب جب بھی کسی تقریب میں مدعو کیے جاتے تو وہ تیار شدہ تقریر پڑھنے کی بجائے زبانی گفتگو کو ترجیح دیتے۔ اس سلسلے میں فخر الدین بلّے انہیں تیاری کراتے۔ وزیر اعلیٰ کے اس قدر قریب ہونے کے باوجود اپنی طبعی شرافت اور وضع داری کے باعث انہوں نے ذاتی فوائد حاصل کرنے سے احتراز کیا۔ اپنے محکمے کے کاموں میں انہیں مہارت حاصل تھی اور جب وہ ریٹائر ہو گئے، اس وقت بھی حسبِ ضرورت محکمے کے لوگ ان سے رہنمائی حاصل کرنے ان کے ہاں آتے رہتے تھے۔ ایک روز میں ان کے ہاں حاضر تھا۔ اس روز پنجاب کا سالانہ بجٹ اسمبلی میں پیش کیا گیا تھا۔ محکمہ اطلاعات سے ایک سیکشن آفیسر آئے اور گزارش کی بجٹ کے بارے میں ایک خبر انگریزی زبان میں تیار کر دیں تاکہ پریس

ریلیز کے طور پر بھجوائی جائے۔ بلّے صاحب اس وقت اس موڈ میں تھے کہ یہ درخواست ان پر بار گزری۔ پہلے تو انہوں نے نرمی سے انکار کر دیا لیکن سیکشن آفیسر کے اصرار پر کہا میں بجٹ کی تفصیلات سے بالکل ناواقف ہوں، تاہم چونکہ ہر سال ایک جیسا بجٹ پیش کیا جاتا ہے، اس لئے میں خبر تیار کر دیتا ہوں۔

پھر سیکشن آفیسر کو روانی سے انگریزی میں نادیدہ بجٹ کے بارے میں خبر لکھوائی اور وہ مطمئن ہو کر چلا گیا۔

فخر الدین بلّے ادیب، شاعر، صحافی اور دانشور تھے۔ بطور صحافی انہوں نے بہت سے رسائل و جرائد کی ادارت کے فرائض انجام دیئے۔ جن دنوں میں ان کی ہمسائیگی میں رہتا تھا، اس زمانے میں دو پرچے ان کی ادارت میں باقاعدگی سے شائع ہوتے تھے۔ ایک ''نوائے بلدیات'' تھا اور دوسرا ''آوازِ جرس''۔ نوائے بلدیات سرکاری پرچہ تھا اور اس کا مزاج عام سرکاری پرچوں جیسا تھا، جو ایک طرح سے مدیرانہ مجبوری تھی لیکن ''آوازِ جرس'' کا مزاج علمی اور ادبی تھا۔ اس میں ملک کے نامور ادیبوں اور شاعروں کی نگارشات باقاعدگی سے شائع ہوتی تھیں۔ شعرا اور ادبا کے بارے میں خاص نمبر نکالے جاتے تھے اور نادر و نایاب تخلیقات سے اس کے صفحات مزین کئے جاتے تھے۔ اس پرچے کی ترتیب و اشاعت میں بلّے صاحب اور ان کا سٹاف بہت محنت کرتا تھا۔ چنانچہ یہ شمارے معنوی اور صوری حسن سے آراستہ ہوتے۔ ادیبوں کی تحریروں کے عکس شائع ہوتے اور تصویروں سے قارئین کی دلچسپی میں مزید اضافہ کیا جاتا۔ ''آوازِ جرس'' میں ادبی گروہ بندیوں سے بالاتر رہ کر مواد شائع کیا جاتا۔ مجھے معلوم نہیں کہ یہ شمارے محفوظ ہیں یا نہیں؟ اس بات کی بڑی ضرورت ہے کہ ان کی فائل تیار کر کے اہم کتب خانوں میں محفوظ کر دی جائے ورنہ بہت سی نادر چیزیں ضائع ہو جائیں گی۔

بلّے صاحب تحمل کا پیکر تھے۔ ان کے بچوں نے بھی باپ ہی کے مزاج پر خود کو ڈھال رکھا تھا۔ ظفر معین بلّے اکثر میرے ہاں تشریف لاتے رہتے تھے۔ بڑے شائستہ اور منکسر المزاج نوجوان تھے۔ معلوم نہیں آج کل کہاں ہیں؟ بلّے صاحب کے احباب کے علم میں ہوگا کہ ان کے ایک نوجوان بیٹے آنس معین نے ملتان میں خودکشی کر لی تھی۔ نوجوان بیٹے کی موت باپ کے لیے کتنا بڑا صدمہ ہے، سب لوگ اس سے آگاہ ہیں۔ بلّے اور ان کے ''فرزندان'' ہمت کے پہاڑ تھے، جنہوں نے یہ عظیم صدمہ حوصلے سے برداشت کر رکھا تھا۔ آنس معین بہت اچھے ابھرتے ہوئے شاعر تھے۔ بلّے صاحب اپنے اس فرزند کے

صدمے کو کم کرنے کیلئے ان کا کلام ''آوازِ جرس'' میں شائع کرتے رہتے تھے اور ان کے کلام کے بارے میں تنقیدی مضامین بھی شاملِ اشاعت کیا کرتے تھے اور اس بہانے اپنے فرزند کو یاد کرتے اور دنیائے ادب سے انہیں متعارف کرانے کا سلسلہ جاری رکھتے۔

سیّد فخر الدین بلّے کو اللہ نے حسنِ صورت سے نواز رکھا تھا۔ سرخ و سفید رنگ، تیکھے نین نقوش، خوبصورت گھنے بال اور متوازن و متناسب قد و جسم، وہ خوش رو ہی نہ تھے۔ بڑے خوش لباس بھی تھے اور ہر طرح کا لباس ان پر جچتا تھا لیکن وہ عوامی سوٹ اور واسکٹ پہننے میں سہولت محسوس کرتے تھے اور اس میں بھی بہت باوقار معلوم ہوتے تھے۔ علی گڑھ کے لہجے میں بات کرتے تھے اور علی گڑھ کے فارغ التحصیل حضرات کی طرح بڑی دلچسپ گفتگو کرتے تھے۔ بڑے شائستہ اور شستہ انداز میں گفتگو کرتے ہوئے اس میں مزاح کی آمیزش کرتے تھے اور طنز سے اجتناب کرتے تھے۔ جو شرفا کا طریقِ گفتار ہے۔ ان کی گفتگو مطالعے اور تجربے کا امتزاج ہوتی تھی مگر اتنی سہل اور رواں کہ کسی پر بار نہیں گزرتی تھی۔ ان سے ملنے والے ایک خوشگوار اور ہمدرد شخصیت کا نقش دل پر لئے ہوئے ان سے رخصت ہوتے تھے۔

بلّے صاحب نے یقیناً بہت کچھ لکھا۔ ''وفیاتِ نامورانِ پاکستان'' کے مرتب ڈاکٹر منیر احمد سلیچ نے لکھا ہے کہ فخر الدین بلّے نے درجنوں کتابیں تصنیف کیں۔ میں نے اس سلسلے میں بلّے کے دوست اور نامور ادیب ڈاکٹر وزیر آغا سے استفسار کیا تو انہوں نے فرمایا کہ بلّے صاحب یقیناً کثیر التصانیف تھے لیکن ان کی بیشتر کتابیں محکمانہ ضروریات کی وجہ سے ''دوسروں'' کے نام سے شائع ہوئیں۔ بلّے صاحب بہت اچھے شاعر تھے۔ ان کا جو کلام ان کی زبانی سننے کا موقع ملا، وہ متاثر کن تھا اور پختگیِ فن کا نمونہ ہونے کے ساتھ انفرادیت کا حامل بھی تھا۔ اسی طرح وہ ایسی نثر لکھنے پر قادر تھے جس میں اظہار و ابلاغ کا عنصر عمدگی سے جلوہ گر ہوتا تھا۔ ان کی ذات میں جتنا تنوع تھا، اسی قدر رنگا رنگی ان کی نظم و نثر میں بھی موجود تھی لیکن ان کی بہت کم تحریریں کتابی صورت میں طبع ہو سکیں۔ ''آوازِ جرس'' کے شماروں کے آخری صفحے پر ایک اشتہار شائع ہوا کرتا تھا۔ ''آوازِ جرس'' پبلی کیشنز لاہور کی مطبوعات ... اس میں بلّے صاحب کی جن کتابوں کا ذکر ہوتا تھا، ان میں ولایت پناہ (سیرت حضرت علیؓ) سوچ سفر (نظموں کا مجموعہ)، سوچ رنگ (غزلوں کا مجموعہ)' در ولایت پر دستک اور اسلام اور فنونِ لطیفہ شامل ہیں، لیکن ہر کتاب کے ساتھ ''زیرِ طبع'' تحریر ہے۔ یقیناً یہ میری کم علمی ہے کہ ان کی

اشاعت یا عدم اشاعت کے بارے میں حتمی طور پر کچھ بتانے سے قاصر ہوں۔ ریٹائر ہونے کے بعد بلّے صاحب نے پھر سے ملتان میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ جہاں 28 جنوری 2004 کو وہ اس جہانِ فانی سے عالمِ جاودانی کو سدھار گئے۔ غالباً انہیں اپنی بیشتر تحریروں کو یکجا کرنے کی فرصت نہ مل سکی۔ (مرحوم) فخرالدین بلّے کو خراجِ تحسین پیش کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان کی اہم تحریروں کو منظرِ عام پر لایا جائے۔ تصانیف کی اشاعت کا کام تو سہل نہیں ہوگا لیکن ان کی منتخب نظم و نثر چند مجموعوں کی صورت میں شائع ہو جائے تو اہلِ ادب اور عام قارئین کو اندازہ ہو سکے گا کہ کتنا باصلاحیت شخص خاموشی سے چلا گیا۔ مجید امجد کے درج ذیل اشعار سیّد فخرالدین بلّے جیسی شخصیات کو مدِ نظر رکھ کر کہے گئے تھے۔

ہمی نے دیکھا ہے اس کو ہمیں خبر ہے وہ شخص
دلوں کی روشنیاں تھا، دلوں کی زندگیاں

ہمیں خبر ہے بڑے حلم و آبرو والے
ترا مقام کسی اور کو نصیب کہاں

جگہ جگہ تری موجودگی کو پاتے ہیں
ہمارے دردِ فراواں ہمارے اشکِ رواں

ترے لئے جھکے مینائے کوثر و تسنیم
ترے لئے کھلیں درہائے روضہء رضواں

مجید امجد کی نظم بلاشبہ بڑی شان دار ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سید فخرالدین بلّے کے کچھ اشعار بھی قارئینِ ادب کی نذر کر دیے جائیں۔ شبنم رومانی نے 1990 کی دہائی میں ادبی تنظیم قافلے کے پڑاؤ میں شرکت کے بعد ''سید فخرالدین بلّے کی بیاض کے ساتھ سات دن'' کے زیرِ عنوان ان کے انتخابِ کلام کو کتابی شکل دی تھی۔ اسی انتخابِ کلام میں سے سید فخرالدین بلّے کے کچھ اشعار ملاحظہ کیجئے۔

نہ آئینے کا بھروسہ، نہ اعتبارِ نظر
جو روبرو ہے مرے کوئی دوسرا ہی نہ ہو

میں جانتا ہوں مگر تو بھی آئینہ لے کر
مجھے بتا کہ مرا انتخاب کیسا ہے؟

اپنی کتابِ زیست پہ تنقید کے لئے
آخر میں چند سادہ ورق چھوڑ جاؤں گا

تلاشِ رزق ہو یا جستجوئے معرفت بلّے
ہماری زندگی شعر و ادب یوں بھی ہے اور یوں بھی

☆☆☆☆☆

افتخار نسیم ___ شخص و فن

افتخار نسیم ایک کاسموپولیٹن شخصیت ہیں۔ ان کی شخصیت کی طرح ان کے فن اور فکر کی بھی مختلف جہتیں ہیں - موجودہ تقریب کا ظاہری کینوس تو ان کے کالموں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے کئی امریکی اور پاکستانی اخبارات کے لیے لکھے۔ لیکن ان کی ذات اور فن کی ہمہ گیری کی بنا پر ان کے بارے میں کچھ کہنے یا لکھنے کو صرف اس کتاب تک محدود نہیں کیا جاسکتا۔ وہ بنیادی طور پر تو شاعر ہیں۔ تاہم ان کی ثانوی سرگرمیوں میں پورا ایک جہانِ رنگ و بو شامل ہے۔ افسانہ اور مضمون نگاری، کالم رائٹنگ، براڈ کاسٹنگ، ٹی وی انکریج (Anchorage) لیکچرنگ، کارپوریٹ بزنس، فلاحی منصوبہ بندی، جہاں گردی اور اپنی مخصوص فکر و عمل کی تشہیر و ترویج ہیں۔

میرے ٹیچنگ کیریئر کے ابتدائی دور میں افتخار نسیم بطور شاگرد نمودار ہوئے۔ وہ ایک خوش مذاق، محفل پسند اور ذہین نوجوان نظر آتے تھے، جس کو تعلیمی سرگرمیوں سے بھی خاصی دلچسپی تھی۔ یہ ایک خوش گوار پہلا امپریشن تھا، جو ان کے انتھر و پلوجیکل (Anthrolological) عقائد سے اختلاف کے باوصف، میرے ذہن میں آج تک قائم ہے۔

افتخار نسیم ایک فنکار ہے۔ اس کا فن اس کی قلمکاری ہے۔ ایک علمی اور نسبتاً خوش حال گھرانے سے تعلق رکھنے کے باوجود اس کی ابتدائی زندگی جذباتی اور مادی عُسرت میں گزری۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُس نے اپنی محرومیوں کی تشخیص اور ان کی مسیحائی کا راستہ خود ہی دریافت کرلیا۔ اِسے چاہے آپ اچھا سمجھیں یا بُرا وہ اپنی Conviction پر قائم ہے۔ فی زمانہ یہ ایک بڑی بات ہے۔

اس پس منظر میں ''افتی نامہ 2'' کی تحریریں اور زیادہ معنی خیز نظر آنے لگتی ہیں۔ کالم نگاری کوئی آسانی کام نہیں۔ ''یہ حُسن پرستی'' کی

سید افسر ساجد

ہوس نہیں بلکہ جاں سوزی کا ایک ایسا عمل ہے جس میں لکھنے والا لحہ بہ لحہ مرتا ہے اور جیتا بھی۔ اس حقیقت کو ہمارے ملکی تناظر میں حسن نثار، منو بھائی، نذیر ناجی، ایاز امیر، مسعود حسن، محمد علی صدیقی، عبدالقادر حسن، کاؤس جی، عطاالحق قاسمی، آغا اکبر اور ان کے دیگر ممتاز معاصرین سے زیادہ اور کون جانتا ہے۔ ان کالموں میں افتخار نسیم کا انداز بیان ہلکا پھکا اور رویہ معقول یعنی Rational ہے۔

اخباری کالموں کے موضوعات عموماً ہنگامی نوعیت کے ہوتے ہیں، لیکن کچھ ایسے کالم بھی ہوتے ہیں جن کی بازگشت حال سے مستقبل میں منتقل ہو جاتی ہے۔ افتخار نسیم کے بہت سے کالم اسی کیفیت کے حامل ہیں۔ اس نے اپنے تجربے، مشاہدے اور مطالعہ کو ان تحریروں میں نچوڑ دیا ہے۔ وہ ایک سچا محبِ وطن ہے جو دیارِ غیر میں پاکستانیت کا پرچم لہرا رہا ہے۔ تصور پسند ہونے کے ناطے اسے جب ہے اور ہونا چاہیے، کے درمیان اک لایعنی بُعد نظر آتا ہے تو وہ اگر سراسیمہ نہیں تو پریشان ضرور ہو جاتا ہے۔ انسانی اور اخلاقی اقدار کی پامالی اس کی دُور رنجی کا باعث ہے۔ وہ مفروضوں پر نہیں حقائق پر بات کرتا ہے۔ اس کا طنز و مزاح سرجیکل نہیں Suggestive ہے۔

مجھے ذاتی طور پر افتخار نسیم کے یہ کالم بہت اچھے لگے ہیں۔

(1) کیا پاکستان کافی ہے؟ (2) ہم پشاور میں قائد اعظم کو خوش آمدید کہتے ہیں (3) مائی نیم از خان! (4) احمد فراز کی حسِ مزاح اور پچھتاوے (5) یہ گھر گرہستی ہے (6) پاکستان پر تنقید کرنا چھوڑ دیں (7) شاہ رُخ خان سنڈ وم (8) یوروپین ٹور (9) دوغلا پن (10) آج اکھاں وارث شاہ نوں! (11) میں نے 'مدر ڈے' پر کیوں نہیں لکھا؟ (12) ادب اور ادیب، شاعری اور شعراء

اور اس کا نیم سوانحی کالم 'بھی پیدا نہ ہوئے بیٹے کے نام سے ایک' (جو اس نے اطالوی صحافی اور اوریانا فالیسی کے مشہور ناول "Letter to a child never born" سے متاثر ہو کر قلمبند کیا ہے) اس مجموعہ کی کریم ہے۔

کالم نگار کی تمام آرا سے اتفاق کرنا ضروری نہیں ہوتا۔ افتخار نسیم کے کالموں پر بھی یہ بات صادق آتی ہے۔ کئی مقامات پر ایک باخبر قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ اُس نے اپنے مفروضات کی پوری چھان پھٹک نہیں کی۔ خصوصاً سیاسی موضوعات کی تشنہ لبی اس ضمن میں نمایاں ہے۔

☆☆☆☆☆

پروفیسر نصیرالدین ہاشمی کی ادبی ولسانی خدمات:
تحقیقی وتجزیاتی مطالعہ

Abstract

Naseer ud Din Hashmi (1895-1964) was one of the influential literary persons of the twentieth century who left an indelible mark in the Urdu literary world based on his research efforts. He made Deccani literature his cloak and followed it throughout his life and preserved it by taking a research look at Deccanism. He traces Urdu in West India. His main argument is that long before the rise of Islam, Arabs used to visit India on the Malabar Coast for trade purposes. During that period, the language that became the common medium of expression between the Arabs and the local people of the Deccan is Urdu. This article presents his literary and linguistic contributions with reference to his books especially Deccan Mein Urdu, Europe Mein Deccani Makhtotaat, Maqalaat e Hashmi and Deccani Culture. His writings also provide a basis and a model for those doing research on how the development of Urdu has happened or is happening in different regions.

Keywords:

Naseer ud Din Hashmi, linguistics, Deccani, culture, Ancient manuscripts, feminist world, tradition

نصیرالدین ہاشمی (1895-1964) کا شمار بیسویں صدی کی اُن شخصیات میں ہوتا ہے، جنھوں نے اپنی تحقیق کی بدولت اُردو دنیا پر نمایاں اثرات مرتسم کیے۔ دکن، دکنی زبان اور اُس کا ادب اُن کی دلچسپی کے خاص موضوعات تھے۔ وہ اُردو کا سراغ جنوبی ہند بالخصوص دکن میں لگاتے ہیں۔ اُردو زبان کے آغاز وارتقا کے حوالے سے اُن کی تحقیق کا بنیادی استدلال یہ ہے کہ عرب، اسلام کی آمد سے قبل ہی ہندوستان میں مالابار کے ساحلوں پر تجارت کے سلسلے میں آیا جایا کرتے تھے۔ یہی وہ زمانہ تھا، جب عربوں اور مقامی آبادی کے باہمی روابط کی بدولت دکن میں اُردو کے آثار نمایاں ہوئے۔ اِس تحقیقی مقالے میں نصیرالدین ہاشمی کے ادبی و لسانی زاویوں کا جائزہ دکنیات کے خصوصی تناظر میں پیش کیا گیا ہے۔ اِس ضمن میں اُن کی تحریروں بالخصوص ''دکن میں اُردو''، ''یورپ میں دکنی مخطوطات''، ''مقالاتِ ہاشمی'' اور ''دکنی کلچر'' کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ اُن کی تحقیق ایسے سکالرز کے لیے بھی تحقیقی وتنقیدی بنیاد فراہم کرتی ہے، جو اُردو کے آغاز وارتقا کو مختلف خطوں کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

نصیرالدین ہاشمی کا خاندان 1857 کی جنگِ آزادی کے بعد سے حیدرآباد، دکن میں آباد ہے۔ اُنھوں نے منشی اور مولوی عالم کا امتحان دارالعلوم، حیدرآباد سے پاس کیا۔ حضرت امجدؒ حیدرآبادی اُن کے دارالعلوم، حیدرآباد میں استاد تھے جن سے ہاشمی صاحب کا عمر بھر کا ساتھ رہا۔ وہ دارالعلوم، حیدرآباد میں اپنے طالب علمی کے زمانے میں کالج کی تنظیم ''انجمن ثمرۃ الادب'' کے سیکرٹری رہے۔ اُنھیں شروع سے ہی علمِ زبان وادب سے بہت زیادہ دلچسپی رہی ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ اُنھوں نے اپنے لیے دو موضوع خصوصیت سے مختص کیے ہیں جن میں دکن کی اُردو زبان کی تاریخ و تنقید، اور نسوانیات۔ (1) یعنی یہ دو موضوعات اُن کی دلچسپی کے خاص میدان تھے۔ درس وتدریس اور تعلیم وتحقیق کے ساتھ براہِ راست اُن کا کوئی تعلق نہیں تھا مگر اِس کے باوجود اُنھوں نے اُردو زبان وادب کے میدان میں کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔ اُنھوں نے دفتر دیوانی فنانس، بلدہ، حیدرآباد، دکن میں ملازمت اختیار کی جہاں سے وہ جسٹرار کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ ''دکن میں اُردو'' (1923) اُن کی شہرہ آفاق تصنیف ہے جس نے اُنھیں شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ اُن کی دیگر نمایاں تصانیف میں ''یورپ میں دکنی مخطوطات'' (1932)، ''سلاطینِ دکن کی ہندوستان شاعری'' (1933)، ''حضرت امجد کی شاعری'' (1934)، ''خواتینِ عہدِ عثمانی'' (1936)، ''مدراس میں اُردو'' (1938)، ''مقالاتِ ہاشمی'' (1939)، ''خواتینِ دکن کی اُردو خدمات'' (1940)، ''فلم نما'' (1940)، ''تاریخ عطیاتِ آصفی'' (1942)، ''حیدرآباد کی نسوانی دنیا'' (1944)، ''کتب خانہ نواب سالار جنگ مرحوم کی اُردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست

''(1957)، ''دکنی ہندو اور اُردو
''(1958)''دکنی (قدیم اُردو) کے چند تحقیقی
مضامین ''(1963)، اور ''دکنی کلچر
''(1963) نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔ اُن کا
انتقال 26 ستمبر 1964 کو حیدرآباد میں ہوا۔
''دکن میں اُردو'' کا پہلا ایڈیشن 1923
میں سامنے آیا جس میں نصیر الدین ہاشمی نے
دکن کے تمام علاقوں کی اُردو کا جائزہ نہایت
جامع انداز سے پیش کیا ہے۔ یہ کتاب مکتبہ
ابراہیمیہ، حیدرآباد، دکن نے شائع کی۔ وہ اس
موضوع پر کتاب کی اشاعت کے بعد بھی کام
کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کا
پہلا ایڈیشن جو محض 180 صفحات پر مشتمل تھا،
مگر جب اس کتاب کا چھٹا ایڈیشن اُن کی
وفات سے کچھ عرصہ قبل سامنے آیا تو
وہ 1100 صفحات پر مشتمل تھا۔ اس کتاب کی
دوسری اشاعت 1926 میں اور تیسری
اشاعت 1932 میں مکتبہ ابراہیمیہ، حیدرآباد
سے ہی ہوئی۔ تیسری اشاعت میں یہ تبدیلی
ہوئی کہ اس میں سے مدراس اور میسور میں
اُردو سے متعلق ابواب نکال دیئے گئے کیوں
کہ ''مدراس میں اُردو'' کے نام سے اُنھوں
نے علیحدہ سے ایک کتاب تشکیل دے دی۔
اس کی چوتھی اشاعت ترمیم و اضافہ کے
بعد 1952 میں مکتبہ معین الادب، لاہور نے
کی اور اس کی پانچویں اشاعت بنا کسی ردو
بدل کے اُردو مرکز، لاہور نے 1960 میں
کی۔ ''دکن میں اُردو'' کی چھٹی اشاعت
1964 میں نسیم بک ڈپو، لکھنؤ نے کی جس میں
ایک جدید باب ''آندھرا میں اُردو'' کا اضافہ
کیا گیا ہے۔ اب تک اس کتاب کے درجنوں
ایڈیشن سامنے آچکے ہیں اور باقی کے تمام
ایڈیشن اُسی چھٹی اشاعت کی بنیاد پر کسی ردو
بدل کے بنا سامنے آئے ہیں۔ ترقی اُردو
بیورو، نئی دہلی (موجودہ قومی کونسل برائے
فروغ اُردو، نئی دہلی) نے اس کتاب کی پہلی
اشاعت 1985 میں کی جس کے اب تک
چار ایڈیشن سامنے آچکے ہیں۔ اس کا موجودہ
جدید طباعت پر مشتمل چوتھا ایڈیشن 2016
میں منظر عام پر آیا۔ نصیر الدین ہاشمی کی اس
شہرہ آفاق کتاب کا تجزیہ اُس جامع ترین چھٹی
اشاعت کی بنیاد پر یہاں پیش کیا جائے گا جس
کو بعد میں ہونے والی تمام اشاعتوں میں
بنیاد بنایا گیا۔ ''دکن میں اُردو'' کو نصیر الدین
ہاشمی نے آٹھ ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ اُن آٹھ
ادوار پر تفصیلی گفتگو سے پہلے اُنھوں نے اُردو
زبان کی مختصر تاریخ بیان کی ہے۔ اس ضمن میں
اُنھوں نے جنوبی ہند میں اُردو کی ابتدا اور اُس
کی ترقی، اُردو کی ابتدا، پراکرت، دکن میں
اُردو کی ابتدا، اُردو کے نام، دکن میں اُردو نثر و
نظم کی ابتدا، دکنی نثر کی ابتدا، اور دکنی کا پہلا
شاعر اور نظم کی ابتدا جیسے مباحث پر روشنی ڈالی
ہے۔ آٹھ ادوار کی تفصیل کے بعد اخبارات و
رسائل، ماہوار اور سہ ماہی رسالے، اور اُردو
کے اداروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اُن آٹھ ادوار
کی وضاحت کچھ یوں ہے:(2)

دور	نام	دورانیہ
پہلا دور	بہمنی دور	747ھ تا 900ھ
دوسرا دور	قطب شاہی و عادل شاہی دور	901ھ تا 1100ھ
تیسرا دور	مغلیہ دور	1101ھ تا 1136ھ
چوتھا دور	سلطنت آصفیہ اور اُردو	1136ھ تا 1220ھ
پانچواں دور	سلطنت آصفیہ اور اُردو	1220ھ تا 1301ھ
چھٹا دور	سلطنت آصفیہ اور اُردو	1301ھ تا 1336ھ
ساتواں دور	سلطنت آصفیہ اور اُردو	1336ھ تا 1375ھ
آٹھواں دور	آندھرا میں اُردو	1376ھ تا 1376ھ/1956ء

ہندوستان میں غیراقوام کے باشندے شروع سے ہی آتے اور آباد ہوتے رہے ہیں۔ نصیرالدین ہاشمی کا خیال ہے کہ آریائی قوم نے جب شمالی ہندوستان پر حملہ کیا تو اُنھوں نے وہاں کے لوگوں کو جنوبی ہندوستان میں منتقل ہونے پر مجبور کر دیا۔ اُن کی زبانوں میں تامل، تلگو، اُڑیا وغیرہ جیسی زبانیں شامل تھیں، جس کے باعث آج بھی دکن میں ان زبانوں کا چلن موجود ہے۔ آریاؤں نے اپنی زبان کو اعلیٰ ثابت کرنے کے لیے اُس کے قواعد کے اُصول مرتب کیے اور اُس کے نتیجہ میں سنسکرت ہمارے سامنے آئی۔ سنسکرت کے مقامی زبانوں کے ساتھ روابط سے پراکرت کا وجود ممکن ہوا۔ سنسکرت تو پنڈتوں تک محدود رہی مگر یہ پراکرت عوام کی زبان بن کر سامنے آئی۔ ہاشمی صاحب نے پروفیسر دیپر کی لسانی تحقیق سے استفادہ کرتے ہوئے خیال ظاہر کیا ہے کہ چھٹی صدی عیسوی تک بیس سے زائد پراکرتیں بولی جاتی تھیں، جن میں پانچ زیادہ معروف و مقبول ہوئیں۔ ان پراکرتوں میں پالی، جینی، مہاراشٹری، سوراسنی اور مگدھی شامل ہیں۔ ’’اُردو زبان برج بھاشا سے نکلی‘‘ جیسے قیاس آرائی پر مبنی لسانی تصور کو نصیرالدین ہاشمی مسترد کرتے ہیں اور اس ضمن میں لکھتے ہیں:

’’سوراسنی کا دوسرا نام برج بھاشا ہے۔ یہ زبان بہت وسیع علاقہ میں بولی جاتی تھی۔ سندھ سے بہار اور لاہور سے مالوہ تک اُس کی وسعت تھی۔ اُردو زبان کا مخزن اُسی برج بھاشا کو قرار دیا گیا تھا مگر جدید تحقیقات کی رو سے یہ بات پوری طرح صحیح نہیں ہے‘‘۔(3)

دکن میں اُردو کی روایت کے آغاز سے قبل کم و بیش ایک صدی تک اُردو شمالی ہند میں پروان چڑھتی رہی۔ دکن میں اُردو کو ہندی اور ہندوی جیسے ناموں سے یاد کیا جاتا تھا۔ زبان کے لیے دکنی بھی اُردو کے ایسے ہی

قدیم ناموں میں سے ایک ہے۔ عبدالقادر سروری (1906-1971) کے نزدیک دکنی قدیم اُردو کا وہ روپ ہے، جس کی ادبی نشوونما ابتدائی زمانے میں دکن اور گجرات میں چودھویں صدی عیسوی کے نصف آخر سے سترھویں صدی کے اواخر کے دوران ہوئی۔ (4) شمالی ہند سے جو زبان دکن میں گئی، وہ دکنی اور وہی زبان گجرات میں گجری یا گجراتی کہلائی۔ یہ کوئی اور نہیں بلکہ اُردو زبان ہی تھی، جس کا آغاز دیگر جدید ہند آریائی زبانوں کی طرح گیارھویں صدی عیسوی کے اوائل سے ہوا۔

اُردو زبان سے متعلق عمومی طور پر پائے جانے والے چار نظریات کی طرف اُنھوں نے اشارہ کیا ہے جن میں اُردو کی ابتدا پنجاب سے ہوئی، سندھ سے ہوئی، دکن سے ہوئی، اور دوآبہ گنگا جمنا سے ہوئی، شامل ہیں۔ اُردو زبان کے آغاز کے حوالے سے ماہرین کے ہاں دو باتیں عموماً پائی جاتی ہیں۔ پہلی بات اُردو زبان کا تعلق مسلمانوں کی ہندوستان آمد کے ساتھ ہے۔ دوسری بات اُردو زبان ہندوؤں اور مسلمانوں کے ملاپ کی ایک اہم یادگار ہے۔ اِنھی دونوں باتوں پر نصیرالدین ہاشمی بھی یقین رکھتے ہیں۔ مسلمانوں کی آمد سب سے پہلے سندھ، پنجاب اور دکن کے علاقوں میں ہوئی۔ اِسی بات کو بنیاد بنا کر ہاشمی صاحب کی رائے ہے کہ جن اصحاب کا دعویٰ ہے کہ اس (اُردو) کی ابتدا سندھ اور دکن سے ہوئی وہ ایک حد تک غلط نہیں ہو سکتا۔ (5) محض اِس بات کو بنیاد بنا کر کہ مسلمان چوں کہ سب سے پہلے سندھ، پنجاب اور دکن میں آئے لہٰذا اُردو کی ابتدا اُنھی دونوں علاقوں سے ہوئی، ناکافی ہے۔ سندھ میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے ملاپ سے اگر کوئی نئی زبان وجود میں آتی تو اُس میں عربی اور سورا سینی کا اشتراک نمایاں نظر آتا مگر وہاں تو فارسی زبان کے الفاظ زیادہ نظر آتے ہیں۔ لہٰذا جدید لسانی تحقیق کی بنیاد پر سندھ کو اُردو کا مولد قرار دینا درست نہیں۔ یہی استدلال دکن اور پنجاب میں اُردو کے حوالے سے بھی درست ثابت ہوتا ہے۔ نصیرالدین ہاشمی بھی اِسی استدلال کے باعث بعد میں اِس خیال کے حامی ہیں کہ اُردو کا مولد سندھ، دکن اور پنجاب نہیں۔ اُردو کا مولد ہونے سے متعلق وہ دوآبہ گنگا جمنا کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اِس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

''مسلمان فاتحین شمال کی جانب سے ہندوستان میں داخل ہوئے تو اول اُنھوں نے پنجاب میں قیام کیا مگر اُس کے بعد دہلی کی جانب پیش قدمی کی۔ مسلمانوں کے صدہا خاندان جو ترک، مغل اور افغان تھے جن کی زبان عام طور سے زیادہ تر فارسی تھی۔ پنجاب سے لے کر دہلی تک آباد ہو گئے۔ اُس زمانہ میں یہاں'' جدید ہندوآریائی دور

کی پراکرت'' زبان بولی جاتی تھی۔ اُس دیسی زبان میں غیر ملکیوں کی زبان کی آمیزش ہونے لگی اور اِس امتزاج سے اُردو کی پیدائش ہوئی''۔(6)

دہلی فتح کرنے کے بعد مسلمان فاتحین نے جنوبی ہندوستان کے علاقوں کی طرف رخ کیا۔ وہاں ابھی اُردو زبان پختہ نہیں ہوئی تھی مگر جب یہ فاتحین دکن میں گئے تو اُس زبان کو وہاں پھلنے پھولنے کا نمایاں مواقع ملے اور جلد ہی اُسے وہاں قبول عام حاصل ہوا۔ دکن میں اُردو کے مختلف ناموں کے حوالے سے اُنھوں نے دکھنی اور ہندی دو نام ہی درج کیے ہیں جب کہ اُردو شمالی ہند میں ریختہ، اُردو، اُردوئے معلّٰی وغیرہ جیسے ناموں سے منسوب رہی۔ بہمنی سلطنت 1347 میں قائم ہوئی، جو دکن کے پورے علاقے سمیت جنوبی ہند کے مختلف خطوں میں پھیل چکی تھیں۔ بعدازاں یہ دکن کے مختلف علاقوں میں پانچ خود مختار سلطنتوں میں تقسیم ہو گئیں۔ مرزا خلیل احمد بیگ (پ: 1945) کے خیال میں دکن کی خود مختار سلطنتوں نے اُردو کی ترقی اور اُس کی ترویج و اشاعت میں جی کھول کر حصہ لیا۔ (7) وہ ریاستیں بریدشاہی سلطنت (بیدر)، عمادشاہی سلطنت (برار)، نظام شاہی سلطنت (احمد نگر)، عادل شاہی سلطنت (بیجاپور) اور قطب شاہی سلطنت (گول کنڈہ) کی صورت میں سامنے آئیں۔

ولیؒ نے زبان اُردو زبان کے لیے ریختہ کا لفظ استعمال کیا، جو اُنھوں نے اپنے سفرِ دہلی کے بعد سے استعمال کیا۔ دکنی نثر کی ابتدا کے حوالے سے نصیرالدین ہاشمی خیال ظاہر کرتے ہیں کہ جدید تحقیقات کی روشنی میں حضرت خواجہ بندہ نواز گیسودراز سید محمد حسینی وہ پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے اِس کی ابتدا کی اور ''معراج العاشقین'' اور ''ہدایت نامہ'' وغیرہ مرتب کیے۔ (8) دکنی کا پہلا شاعر بھی وہ اُنھیں ہی قرار دیتے ہیں۔ اُن کے خیال میں دکن میں اُردو نثر کا آغاز شاعری سے پہلے ہوا۔ شاعری کے حوالے سے پہلے نظم میں مثنوی، پھر رباعی، غزل اور قصیدہ کا آغاز ہوا۔ پہلے دور کو اُنھوں نے بہمنی دور کا نام دیا ہے جو 747ھ تا 900ھ تک محیط تھا۔ اِس دور میں اُنھوں نے بہمنی دور کی تاریخ کا جائزہ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ دس نثر نگاروں اور شاعروں کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ دوسرے دور کو اُنھوں نے قطب شاہی اور عادل شاہی دور کا نام دیا ہے جو 901ھ تا 1100ھ تک محیط تھا۔ اُس دور میں اُنھوں نے قطب شاہی اور عادل شاہی اُردو کے علاوہ نظام شاہی اور بریدشاہی اُردو کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ اُس دور کی تاریخ بیان کرنے کے علاوہ اُنھوں نے چونتیس قطب شاہی اُردو شاعروں اور چھ نثر نگاروں کا تذکرہ کیا ہے۔ عادل شاہی دور کی تاریخ بیان کرنے کے علاوہ انتیس

شاعروں اور دو نثر نگاروں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ نظام شاہی اُردو کے ضمن میں تین شاعروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ برید شاہی دور سے دکن میں مرثیے کا آغاز ہوا جس میں ہاشمی صاحب نے اٹھارہ شاعروں کا تذکرہ کیا ہے۔ تیسرے دور کو مغلیہ دور کا نام دیا گیا ہے جو 1101ھ تا 1136ھ تک محیط تھا جس میں اکتیس شعرا کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ چوتھے، پانچویں، چھٹے اور ساتویں ادوار کو سلطنت آصفیہ اور اُردو کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ چوتھا دور 1136ھ تا 1220ھ تک محیط تھا جس میں پینسٹھ عمومی شاعروں کے علاوہ پندرہ مرثیہ گو شاعروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ پانچواں دور 1220ھ تا 1301ھ تک محیط تھا جس میں اکتالیس شاعروں کا تذکرہ پیش کرنے کے علاوہ اُس دور کی نثر کا جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

چھٹا دور 1301ھ تا 1336ھ تک محیط تھا۔ اِسی دور میں اُردو کو سلطنتِ آصفیہ کی سرکاری زبان قرار دیا گیا۔ اُس دور کے چوبیس شعرائے محبوبی اور ستائیس شعرائے عہدِ عثمانی کا تذکرہ پیش کیا گیا ہے۔ اُسی دور کی پانچ معروف انجمنوں کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے جن میں انجمن ترقی اُردو، ایجوکیشنل کانفرنس، اقبال کلب، عثمانیہ ریڈنگ روم، اور انجمن شمرۃ الادب شامل ہیں۔ ساتواں دور 1336ھ تا 1375ھ تک محیط تھا جس میں کلیہ جامعہ عثمانیہ اور شعبہ تالیف و ترجمہ کے علاوہ چونتیس شاعروں اور تینتیس نثر نگاروں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اُسی دور کی آٹھ خواتین شعرا کے علاوہ نو خواتین نثر نگاروں اور اُن کے کارناموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اُسی دور میں ڈراما اور اداکاری، خطیب اور وکلا، نستعلیق ٹائپ اور اُردو کرنسی نوٹ پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں اخبارات اور رسائل کے ضمن میں چھ شخصیات اور چودہ انجمنوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ آخر میں ''آندھرا میں اُردو'' کے نام سے ایک باب کا اضافہ کیا گیا ہے جس میں انیس مرد شعرا اور چار خواتین شعرا، بارہ مرد نثر نگار اور چھ خواتین نثر نگاروں کا تذکرہ پیش کیا گیا ہے۔ آندھرا میں اُردو ہی کے تناظر میں ہاشمی صاحب نے آٹھ اخبارات و رسائل، سات ماہوار اور سہ ماہی رسائل، اور دس اُردو کے اداروں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ نصیرالدین ہاشمی کی خاصیت یہ ہے کہ وہ ہر باب کے آغاز میں پہلے اُس دور کی مختصر تاریخ بیان کرتے ہیں پھر اُس دور کے شاعروں اور نثر نگاروں کا سوانحی تذکرہ کرنے کے ساتھ اُن کا نمونہ کلام بھی پیش کرتے ہیں۔ خواتین نثر نگاروں اور شاعروں کے علاوہ اُنھوں نے مختلف اُردو اخبارات و رسائل، اداروں اور انجمنوں کا بھی خاطر خواہ ذکر کیا ہے اور ایسا کرتے ہوئے اُنھوں نے نہایت سادہ زبان

استعمال کی ہے۔

نصیرالدین ہاشمی کی کتاب ''دکن میں اُردو'' کو بہت زیادہ پذیرائی حاصل ہوئی جس کی بدولت اُنھیں حکومتِ آصفیہ کی جانب سے وظیفہ پر یورپ روانہ کیا گیا تا کہ وہاں کے کتب خانوں نے بھرپور استفادہ کرتے ہوئے وہ مزید تحقیق کر سکیں۔ ستمبر 1928 کو وہ انگلستان روانہ ہوئے اور وہاں کے کتب خانوں سے ایک سال تک مواد اکٹھا کرتے رہے 1929 میں وہ ہندوستان واپس پہنچے اور واپس آتے ہی وہ اپنی کتاب مکمل کرنے کے بعد اُسے شایع کروانے کے خواہش مند تھے۔ مگر طبیعت کی خرابی کے باعث وہ اِسے جلد مکمل نہ کر سکے اور یوں یہ کتاب ''یورپ میں دکنی مخطوطات'' کے عنوان سے اُن کی یورپ واپسی کے تین سال بعد 1932 میں منظرِ عام پر آئی جسے شمس المطابع، عثمان گنج، حیدرآباد، دکن نے شایع کیا۔ اپنے ایک سالہ یورپ کے قیام کے دوران اُنھوں نے انگلستان، اسکاٹ لینڈ اور پیرس کے کتب خانوں کی خاک چھانی اور وہاں کے کتب خانوں میں موجود مطبوعہ اور غیر مطبوعہ فہرستوں میں موجود اغلاط کی نہ صرف نشان دہی کی بلکہ اُن کی اصلاح بھی کی۔ وہاں کے کتب خانوں میں موجود دکنی مخطوطات کا تذکرہ، دکنی مصنفین کے حالات اور نمونہ کلام کے ساتھ متفرق اُردو اور فارسی نسخوں کے اختلافات اُنھوں نے اپنی اِس کتاب میں وضاحت کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ اُردو زبان کے قدیم ترین مصنفین اور اُن کے کلام کے نمونے (مخطوطات) اِس کتاب میں جامع معلومات کی شکل میں پیش کیے گئے ہیں جو نصیرالدین ہاشمی کی تحقیق کا حاصل ہیں۔ اپنی اِس کتاب میں وہ مخطوطات کا تعارف اِس بہترین انداز سے کرواتے ہیں کہ قارئین کو اصل مخطوطات دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ ''یورپ میں دکنی مخطوطات'' کی ترتیب کے حوالے سے ہاشمی صاحب لکھتے ہیں:

''سب سے پہلے میں نے قطب شاہی مخطوطات کا ذکر کیا ہے۔ اِس کے بعد عادل شاہی پھر دورِ مغلیہ کے بعد سہ ہوٹ پھر میسور اور ارکاٹ کے بعد دورِ آصفیہ کے مخطوطات کا ذکر ہے۔ اِس کے بعد نامعلوم مخطوطے بیان کیے گئے ہیں''۔ (9)

وہ جرمنی کے کتب خانوں سے بھی استفادہ کرنا چاہتے تھے اور اِس مقصد کے حصول کے لیے اُنھوں نے اپنے یورپ میں قیام کی تین ماہ توسیع کی درخواست بھی جمع کروائی تھی جو منظور نہ ہو سکی۔ اُس وقت وہ پیرس میں تھے لہٰذا اُنھیں وہیں سے واپس ہندوستان آنا پڑا۔ ''یورپ میں دکنی مخطوطات'' اُن کی دوسری تصنیف تھی اور اِسے بھی ''دکن میں اُردو'' کی طرح بہت زیادہ پذیرائی حاصل ہوئی۔ 1923 میں

جب ''دکن میں اُردو'' سامنے آئی تب مدراس چوں کہ دکن کا حصہ تھا لہٰذا ''مدراس میں اُردو'' کے نام سے ایک باب اُسی کتاب میں شامل تھا جس میں مدراس میں اُردو زبان کی صورت حال پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ ''دکن میں اُردو'' کا جب تیسرا ایڈیشن شایع ہوا تو ضخامت کے باعث ''مدراس میں اُردو'' والے باب کو اُس کتاب میں سے نکال کر ایک علیحدہ کتاب کی صورت میں شایع کر دیا گیا۔ نصیر الدین ہاشمی نے مذکورہ سبب کے علاوہ اِس کتاب کو لکھنے کے دو امور بیان کیے ہیں جو اِس کے لیے محرک ثابت ہوئے:

''اِس کتاب کو لکھنے کے دو امور محرک ہوئے اول یہ کہ آج سے کئی سال پہلے مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب نے اپنے ایک خطبہ صدارت جو مدراس کی کسی انجمن میں پڑھا گیا تھا، اہلِ مدراس کو توجہ دلائی تھی کہ ''مدراس میں اُردو'' کے نشوونما اور اُس کی ارتقا کی تاریخ لکھی جائے مگر کسی نے آج تک اِس جانب پیش قدمی نہیں کی۔ چوں کہ ''دکن میں اُردو'' کے پہلے اور دوسرے ایڈیشن میں اِس موضوع پر کچھ لکھ دیا گیا تھا اِس لیے اِس کو ایک مستقل صورت میں پیش کر دینا مفید معلوم ہوا۔ دوسرے یہ کہ اگرچہ ہمارے خاندان کو حیدرآباد میں توطن ہوئے ستر سال سے زیادہ ہو چکے ہیں مگر سالہا سال کے قدیم خاندانی تعلق کی بنا پر یہ خیال پیدا ہوا کہ اِس خطہ کی کوئی عملی خدمت انجام دی جائے جہاں بزرگوں نے اپنی ساری ساری عمر علم و ادب کی خدمت میں گزاری''۔(10)

نصیر الدین ہاشمی کا اُردو کے دکن میں پیدا ہونے کا بنیادی استدلال مسلمانوں اور ہندوؤں کا باہمی میل جول ہے۔ پھر وہ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے چوں کہ مدتوں دکن میں قیام کیا، لہٰذا ایک مخصوص زبان کا ظاہر ہونا ناگزیر تھا، جسے وہ اُردو قرار دیتے ہیں۔ ہاشمی نے دکن کے حوالے سے جس نظریے کی بنیاد رکھی، اُس کی انتہائی شکل ڈاکٹر آمنہ خاتون نے ''دکنی کی ابتدا'' میں واضح کی۔ یہاں تک کہ اُنھوں نے دکنی کو اُردو سے بالکل جدا زبان قرار دے دیا۔ اُن کے نزدیک شورسینی اپ بھرنش اور مرہٹی میں عربی اور فارسی کی سات سو سال کے عرصے میں بتدریج آمیزش اور پڑوس کی جدید آریائی زبانوں سے لین دین اور راہ رسم کی وجہ سے مرہٹی کے دوش بدوش دکنی کی نشوونما ہوئی۔(11) یہاں ایک اہم لسانی نکتہ سامنے آتا ہے کہ آیا دو مختلف لسانی خاندانوں کے ملاپ سے ایک ایسی زبان کا وجود ممکن ہے، جو کسی تیسرے لسانی خاندان سے تعلق رکھتی ہو۔ اِس بات کا سادہ سا جواب ہے کہ نہیں۔ ایک طرف دراویدی خاندان مثلاً ملیالم، تامل، کنڑ، مرہٹی اور دوسری طرف سامی خاندان یعنی عربی، تو

اِن کی آمیزش سے ایک تیسرے خاندان یعنی آریائی مثلاً دکنی اُردو کی پیدائش کا امکان خارج از بحث ہے۔

اُردو کی ابتدا سے متعلق بحث ''مدراس میں اُردو'' میں نہیں کی گئی چوں کہ یہ گفتگو تفصیل کے ساتھ ''دکن میں اُردو'' کے تیسرے ایڈیشن میں کی جا چکی تھی۔ مدراس سے مراد کرناٹک، آندھرا، تامل، ملیبار، اور میسور جیسے علاقے ہیں مگر ہاشمی صاحب نے اپنی اِس کتاب میں مدراس سے مراد کرناٹک کو لیا ہے جو مغلیہ دور میں صوبہ کرناٹک کے نام سے جانا پہچانا تھا۔ ''مدراس میں اُردو'' کو اُنھوں نے کل آٹھ ابواب میں تقسیم کیا ہے اور اِن میں شامل شخصیات کو اُنھوں نے عمومی انداز سے پیش کیا ہے یعنی شاعری یا نثر نگاری کی بنیاد پر اشخاص کو بیان نہیں کیا گیا۔ دوسری طرف اِس کتاب میں کسی خاتون کو شامل نہیں کیا گیا کیوں کہ ''خواتینِ دکن کی اُردو خدمات'' کے ضمن میں اُنھوں نے علیحدہ سے ایک کتاب تحریر کی ہے جس میں دکن کی خواتین کے کارناموں کو بیان کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں ایک شخصیت، دوسرے میں گیارہ، تیسرے میں تینتالیس، چوتھے میں چھتیس کے علاوہ شمالی ہند کے بعض متوطن مدراس کے ضمن میں پانچ، پانچویں باب میں مدراس کے مرثیے کے تناظر میں نو، چھٹے باب میں مدراس کے اخبارات اور انجمنیں، ساتویں باب میں سہ ہوٹ میں اُردو اور تین شخصیات، اور آٹھویں باب میں میسور میں اُردو کے تناظر میں حیدر علی و ٹیپو سلطان اور دیگر کتیس شخصیات کے علاوہ میسور کے اخبارات کا احوال بھی بیان کیا گیا ہے۔ نصیرا لدین ہاشمی کے خیال میں صوبہ مدراس میں بولی جانے والی زبانوں میں تلنگی، کنڑی اور تامل وغیرہ کے نام نمایاں حیثیت کے حامل ہیں جب کہ اِن میں سے کوئی ایک زبان بھی پورے صوبے کی لسانی نمائندگی ٹھیک سے نہیں کرتی۔ اگر کوئی زبان پورے صوبہ مدراس میں مستعمل نظر آتی ہے تو وہ صرف ''ہندوستانی'' ہے۔(12) مدراس کے اہلِ قلم کا احوال اِس کتاب میں نہایت اچھے اور جامع انداز میں درج کیا گیا ہے جس کا کریڈٹ مکمل طور پر ہاشمی صاحب کی ذات کو جاتا ہے۔

نسوانیات کے موضوع سے نصیرالدین ہاشمی کو خاصی دلچسپی رہی ہے۔ اِسی بنا پر اُن کی دو کتابیں ''خواتین عہدِ عثمانی'' اور ''خیابانِ نسواں'' کے نام سے شایع ہو چکی تھیں۔ اِسی موضوع پر ''خواتینِ دکن کی اُردو خدمات'' کے عنوان سے یہ اُن کی تیسری کتاب ہے جو کہ دکن کی خواتین کی اُردو خدمات کا مختصر مگر جامع تذکرہ ہے۔ یہ کتاب 1940 میں منظرِ عام پر آئی جسے رزاقی مشین پریس، حیدر آباد، دکن نے شایع کیا۔ ''دکن میں اُردو'' اور ''مدراس میں اُردو'' کی طرز پر

اُنھوں نے اپنی اِس کتاب میں خواتینِ دکن کی اُردو خدمات کا جامع انداز سے تذکرہ پیش کیا ہے۔ اِس کتاب میں ''قلمرو آصفی'' کی حد تک خواتین کی اُردو خدمات کو وضاحت سے بیان کیا گیا ہے جب کہ کسی قدر براڑ، مدراس، میسور اور بنگلور کی خواتین کی اُردو خدمات کا تذکرہ بھی ہوا ہے۔ اپنی اِس کتاب کی ترتیب میں اُنھوں نے دو امور کا خاص خیال رکھا ہے۔ اول یہ کہ اُن خواتین کو بھی اِس کتاب میں شامل کیا گیا ہے جن کی پیدائش تو دکن میں نہیں ہوئی البتہ اُنھوں نے دکن کو بعد میں اپنا وطن بنا لیا۔ دوم یہ کہ اِس کتاب میں نثر یا شاعری کے انتخاب کے سلسلہ میں کسی مخصوص پہلو کو مدِنظر نہیں رکھا گیا۔ اُردو یا ہندوستانی کی ترقی کے لیے دکنی خواتین نے جو خدمت کی ہے اُس کی پانچ مختلف صورتوں کو ہاشمی صاحب نے ذیل کے انداز میں بیان کیا ہے:

۱۔ مولفین اور شعرائے اُردو کی سرپرستی وغیرہ
۲۔ شعر گوئی
۳۔ نثر نگاری و انشا پردازی
۴۔ خطابت
۵۔ صحافت اور انجمنوں کے ذریعے اُردو کی خدمت گزاری (13)

اُن کی اِس کتاب کو آٹھ بنیادی حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے جن میں سب سے پہلے قلمرو آصفی کے حوالے سے اُنھوں نے چوبیس خواتین کا تذکرہ کیا ہے۔ دوسرے حصے میں دورِ عثمانی کا ذکر ملتا ہے جسے شاعری اور نثر نگاری جیسے مزید دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ شاعری کے تناظر میں جامعہ عثمانیہ سے غیر متعلق شاعرات کے حوالے سے اُنھوں نے پچیس خواتین کا تذکرہ کیا ہے اور دخترانِ جامعہ عثمانیہ سے متعلق شاعرات کے حوالے سے دس خواتین کا احوال بیان کیا گیا ہے۔ نثر نگاری کے ضمن میں جامعہ عثمانیہ سے غیر متعلق نثر نگاروں میں اُنھوں نے پچاس خواتین کا ذکر کیا ہے جبکہ دوسری طرف جامعہ عثمانیہ سے متعلق نثر نگاروں میں اٹھائیس خواتین کا ذکر کیا گیا ہے اور اسی حصے میں گیارہ غیر مسلم خواتین کا احوال بھی بیان کیا گیا ہے۔ تیسرا حصہ خطابت کے حوالے سے ہے جس میں بیس خواتین کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ چوتھا حصہ صحافت سے متعلق ہے جس میں سترہ خواتین کا ذکر بیان ہوا ہے۔ پانچواں حصہ حیدرآباد کی نسوانی انجمنوں سے متعلق ہے جس میں چھ انجمنوں کا احوال بیان کیا گیا ہے۔ چھٹا حصہ خواتینِ براڑ کی نظم و نثر کے حوالے سے ہے جس میں چار خواتین کا ذکر ملتا ہے۔ ساتواں حصہ خواتینِ مدراس کی نظم و نثر کے حوالے سے ہے جس میں سترہ خواتین کا ذکر کیا گیا ہے۔ آخری حصہ خواتینِ میسور کی نظم و نثر کے حوالے سے ہے جس میں نو خواتین کی اُردو خدمات کا تذکرہ ملتا ہے۔ دکن کی خواتین کی اُردو

خدمات کے حوالے سے یہ ایک جامع کتاب ہے۔

''دکنی ہندو اور اُردو'' کے عنوان سے نصیرالدین ہاشمی کی کتاب 1958 میں سامنے آئی جسے مکتبہ ابراہیمیہ، حیدر آباد، دکن نے شایع کیا۔ اِس کتاب میں سترھویں اور اٹھارویں صدی کی اُردو کا تذکرہ ملتا ہے جو اُس دور کے تمام ہندو شاعروں اور نثر نگاروں کے تعارف و تذکرہ پر مشتمل ہے۔ ہاشمی صاحب نے یہاں ہندو شاعروں اور نثر نگاروں کی اُردو زبان و ادب کے حوالے سے خدمات پر روشنی ڈالی ہے۔ اِن ہندو ادیبوں اور شاعروں میں کئی ایسے بھی ہیں جن کی مادری زبان اُردو نہیں ہے مگر اُردو زبان و ادب سے اُنھیں گہری دلچسپی اور وابستگی رہی ہے۔ ادبی شخصیات کے علاوہ اُنھوں نے اپنی اِس کتاب میں اخباری ایڈیٹروں اور وکلا کا بھی ذکر کیا ہے۔ ''دکن میں اُردو'' میں نصیرالدین ہاشمی نے سات ادوار کا ذکر کیا ہے۔ اُنھی ادوار کے اعتبار سے اُنھوں نے یہاں ہندو شاعروں اور ادیبوں کا تذکرہ کیا ہے۔ پہلے دور میں کسی ہندو شاعر یا نثر نگار کا ذکر نہیں ملتا۔ دوسرے اور تیسرے دور میں ایک ایک ہندو شاعر کا ذکر کیا گیا ہے۔ چوتھے دور میں انیس شعرا کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ پانچویں دور میں سترہ شاعروں اور چار نثر نگاروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ چھٹے دور میں تینتالیس شاعروں اور چھ نثر نگاروں کا ذکر ملتا ہے۔ آخری دور میں چونیس ہندو شاعروں اور بتیس نثر نگاروں کا احوال بیان کیا گیا ہے۔ فرزندانِ جامعہ عثمانیہ کے حوالے سے بارہ شاعروں اور پانچ شاعرات کا تذکرہ کیا گیا ہے اور اِسی طرح اکتیس مرد نثر نگاروں اور نو خواتین نثر نگاروں کا احوال بیان ہوا ہے۔ اخبارات و رسائل اور اُن کے ایڈیٹروں کے ضمن میں بیس ہندو شخصیات کا ذکر کیا گیا ہے۔ آخر میں آٹھ وکلا کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ ہاشمی کے نزدیک اُردو زبان و ادب کے فروغ میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں نے بھی نہایت اہم کردار ادا کیا ہے اور اِسی سلسلے کی اہم کڑی اُن کی یہ کتاب ''دکنی ہندو اور اُردو'' ہے۔

1963 میں نصیرالدین ہاشمی کے مضامین پر مشتمل ایک کتاب ''دکنی (قدیم اُردو) کے چند تحقیقی مضامین'' کے نام سے سامنے آئی جسے آزاد کتاب گھر، دلّی نے شایع کیا۔ اِس کتاب کے نمایاں مباحث میں قدیم اُردو یا دکنی ادب کے موضوع، قدیم اُردو (دکنی) میں نے سیرۃ النبیؐ کا ذخیرہ، قدیم اُردو کے قصص الانبیا، قدیم اُردو (دکنی) میں نیچرل شاعری، سلطان علی عادل شاہ ثانی اور اُس دور کی شاعری، اُردو میں لیلیٰ مجنوں کی داستانیں، محمد حنیفہ کے متعلق منظوم داستانیں، اور اُردو کی پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ لطف النسا امتیاز کا دیوان اور مثنوی

گلشن شعرا شامل ہیں۔ ''دکنی کلچر'' کے عنوان سے نصیر الدین ہاشمی کی ایک اور کتاب اِسی سال سامنے آئی جسے مجلس ترقی ادب، لاہور نے شایع کیا۔ اپنی اِس کتاب میں اُنھوں نے دکن کے کلچر کی زبردست طریقے سے عکاسی کی ہے اِس ضمن میں اُنھوں نے اِس کتاب کو کل سات بنیادی حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے کے نمایاں مباحث میں دکن میں مسلمانوں کا آکر بس جانا، سواحل ہندوستان پر مسلمانوں کا توطن، عربوں اور ہندوؤں کے قدیم تعلقات، یہودیوں اور مسیحیوں کی آمد ہندوستان میں، سینٹ توما، مسلمانوں کی آمد ساحل ہندوستان میں، مسلمانوں کی بحری اور تجارتی حالت، راجا سیلون کا اسلام لانا، سواحل ہند پر مسلمانوں کی نو آبادی، سواحل ہند پر اسلامی آبادی کا دوسرا دور، ساحل کا رومنڈل، مغربی ساحل، پہلی مسجد بنانے کی یادگار، اور فہرست اولیا دکن شامل ہیں۔ دوسرے حصے کے نمایاں مباحث میں دکن میں مسلمانوں کی سلطنتیں،، سواحل ہند کی مسلمان حکومتیں، دکن کی بہمنی حکومت، بیجاپور کی عادل شاہی حکومت کا علمی و ادبی پس منظر اور تمدنی و معاشرتی پس منظر، گولکنڈہ یا حیدرآباد کی قطب شاہی حکومت، براڑ کی عماد شاہی حکومت، خاندان والا جاہی حکومت کا خاتمہ، سدھوتے اور کرنول کے پٹھانوں کی حکومت (عبدالنبی خان، عبدالحمد خان، عبدالحمید خان، محسن خان، عبدالمجید خان)، اور میسور کی حیدر علی اور ٹیپو سلطان کی حکومت شامل ہیں۔ تیسرے حصے میں دکن میں مغربی (یورپین) تہذیب اور تمدن کا آغاز پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ چوتھے حصے میں زبان و ادب کے مباحث پر روشنی ڈالی گئی ہے جس کے نمایاں مباحث میں جمشید قطب شاہ، سلطان محمد قلی قطب شاہ، آصف، عثمان، نواب غلام محمد غوث والا جاہ کے بعض علمی کارنامے، مہاراجا کشن پرشاد، حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے اُردو کارنامے، شاعری، نثر نگاری، فوجی قواعد وضوابط میں اُردو کا دخل، معاشرت اور رسم رواج میں اُردو کا دخل، موسیقی میں اُردو کا استعمال، ڈراما نگاری، اور حیدر آباد کی قدیم ادبی محفلیں اور انجمنیں شامل ہیں۔ پانچویں حصے میں رہن سہن، مکان، آرکی ٹیکچر، ملبوسات، کھانا پینا، مہمان نوازی، حیدرآباد کے شاہی اور امرا کے دستر خوان، امرا اور جاگیرداروں کے باورچی خانے، ضیافتیں، حقہ، سگار، سگریٹ، شاہی مہمانوں کا جلوس، قدیم دلچسپی کے مشاغل اور دکن کی سواریاں جیسے موضوعات شامل ہیں۔ چھٹے حصے کے نمایاں مباحث میں رسم و رواج، مہینوں کے نام، مہینوں کی تقریبات، شادی بیاہ کی تقریبات، عیدین، ہندو رسومات مسلمانوں میں، قدیم حیدرآباد کے بارہ مہینے اور اُن کے لوازم اور دیگر تقریبات و

تہوار شامل ہیں۔ آخری حصے میں موسیقی کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ یہ کتاب دکنی کلچر کے بارے میں ایک اہم دستاویز کا درجہ رکھتی ہے۔

دکنیات کی روایت میں نصیرالدین ہاشمی ایک خاص حیثیت کے حامل ہیں۔ اُن کے لسانی نظریے سے اختلاف رکھنے کے باوجود ان کی دکنی خدمات سے انکار ممکن نہیں۔ وہ چوں کہ باضابطہ ماہرِ لسانیات نہیں تھے، اِس لیے ان کی تحریروں میں جدید لسانی اُصولوں کی ترجمانی نہیں ملتی۔ مگر دوسری طرف اُنھوں نے دکنی ادب کے آغاز وارتقا اور وہاں نظم ونثر کی تاریخ کو ترتیب دینے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ اِس کے علاوہ اُنھوں نے دکن میں خواتین کی اُردو ادب کے حوالے سے خدمات کو نہ صرف اپنی تحریروں میں جگہ دی، بلکہ دکنی مخطوطات پر تحقیق کرنے میں اُن کا نام سرفہرست ہے۔ دکن میں اُردو زبان وادب پر اظہارِ خیال کی روایت کا آغاز نواب نصیر حسین خاں خیال (1880-1934) کی تصنیف ''داستانِ اُردو'' (1916) سے ہوتا ہے، جسے نصیرالدین ہاشمی نے ''دکن میں اُردو'' کی شکل میں یوں آگے بڑھایا کہ آج دکنیات کی روایت میں اُن کا نام امر ہو چکا ہے۔

حواشی وحوالہ جات

(1) ہاشمی، نصیرالدین۔ خواتینِ دکن کی اُردو خدمات۔ حیدر آباد، دکن: رزاقی مشین پریس، (12) 1940ء

(2) ہاشمی، نصیر الدین ۔دکن میں اُردو ۔نئی دہلی: ترقی اُردو بیورو، (42,43) 1985ء

(3) ایضاً۔ (32)

(4) سروری، عبدالقادر ۔دکنی زبان ۔مشمولہ دکنی اُردو (مرتبہ عبدالستار دلوی) ۔ممبئی: شعبۂ اُردو، بمبئی یونیورسٹی، (329) 1987ء

(5) ہاشمی، نصیر الدین ۔دکن میں اُردو۔ محولۂ بالا (33)

(6) ایضاً۔ (36)

(7) بیگ، مرزا خلیل احمد۔ اُردو کی لسانی تشکیل ۔ کراچی: ادارۂ یادگارِ غالب، (134) 2015ء

(8) ہاشمی، نصیر الدین ۔دکن میں اُردو۔ محولۂ بالا۔ (41)

(9) ہاشمی، نصیر الدین۔ یورپ میں دکھنی مخطوطات ۔حیدرآباد، دکن: شمس المطابع، (11) 1932ء

(10) ہاشمی، نصیر الدین۔ مدراس میں اُردو۔ حیدرآباد، دکن: مکتبہ ابراہیمیہ، (7) 1938ء

(11) خاتون، آمنہ ۔دکنی کی ابتدا۔ بنگلور: ہمدرد پریس، (34) 1970ء

(12) ہاشمی، نصیر الدین۔ مدراس میں اُردو۔ محولۂ بالا (8)

(13) ہاشمی، نصیرالدین۔ خواتینِ دکن

کی اُردو خدمات- محولۂ بالا(18)

مآخذ

آمنہ خاتون -دکنی کی ابتدا -بنگلور: ہمدرد پریس، -1970ء
عبدالستار دلوی - دکنی اُردو(مرتبہ) - ممبئی: شعبۂ اُردو، ممبئی یونیورسٹی، 1987ء
محی الدین قادری زور- دکنی ادب کی تاریخ - کراچی: اُردو اکیڈمی سندھ، 1960ء -
مرزا خلیل احمد بیگ -اُردو کی لسانی تشکیل - کراچی: ادارۂ یادگار غالب، 2015ء -
نصیر الدین ہاشمی- خواتینِ دکن کی اُردو خدمات -حیدر آباد،دکن: رزاقی مشین پریس، 1940ء
نصیرالدین ہاشمی-دکن میں اُردو- نئی دہلی: ترقی اُردو بیورو، 1985ء
نصیرالدین ہاشمی-دکھنی (قدیم اُردو) کے چند تحقیقی مضامین -دہلی: آزاد کتاب گھر، 1963ء
نصیرالدین ہاشمی-دکنی کلچر-لاہور: مجلس ترقی ادب، 1963ء
نصیر الدین ہاشمی-دکنی ہندو اور اُردو-نئی دہلی: ترقی اُردو بیورو، 1984ء
نصیر الدین ہاشمی - مدراس میں اُردو - حیدرآباد،دکن: مکتبہ ابراہیمیہ، 1938ء
نصیر الدین ہاشمی -مقالاتِ ہاشمی - لاہور: تاج کمپنی لمیٹڈ، 1939ء
نصیر الدین ہاشمی - یورپ میں دکنی مخطوطات -حیدرآباد،دکن: شمس المطابع، 1932ء
یوسف سرمست -دکنی ادب کی مختصر تاریخ-حیدرآباد: آل انڈیا اُردو ریسرچ اسکالرس کونسل، 2006ء

☆☆☆☆☆

نبیل احمد نبیل

شاعری کا دفاع [پہلا حصہ]

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں اور قابل قدر ایڈورڈ واٹن بادشاہ کے دربار میں ملازمت کا فریضہ سرانجام دے رہے تھے۔ ایک روز ہم دونوں نے جان پیٹرو پوگلیانو کے محکمہ شہسواری میں گھڑ سواری سیکھنے کا ارادہ کیا۔ اس کے اصطبل میں ویسے بھی سائیس کی ایک عدد آسامی خالی پڑی تھی۔ ہمارا ارادہ جان کر وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا اس لئے اسے یہ ڈر تھا کہ مبادا ہم اپنا ارادہ بدل دیں تو جلد ہی اپنی اطالوی ذہانت سے کام لے کر گھوڑوں اور گھڑ سواری سے متعلق اپنے تجربات ہمارے ساتھ شیئر کرنے لگا۔ ایک طرف وہ گھوڑوں اور شہسواری کی تعریفوں میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہا تھا تو دوسری طرف غصے سے میرے نتھنے پھول رہے تھے۔ اس کے بیان کے مطابق:

''انسانوں میں سب سے معزز انسان ایک فوجی ہوتا ہے اور فوجیوں میں سب سے معزز انسان ایک شہسوار ہوتا ہے۔ جنگ کے ماہر اور امن کے یہ محافظ استقامت کا پہاڑ بن کر بہادری کے جوہر دکھاتے ہیں اس لئے اپنی قوم میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ روئے زمین پر ایسا کوئی شہزادہ نہیں ملے گا جو ایک بہترین گھڑ سوار نہ ہو۔ پوری دنیا میں گھوڑے کا ہم پلہ دوسرا کوئی جانور نہیں۔ یہ نہ صرف وفادار، خوب صورت اور بہادر جانور ہے بلکہ اپنے مالک کی خدمت میں ہمہ وقت مستعد رہتا ہے۔''

پوگلیانو گو کہ ایک مشفق انسان تھا مگر گھوڑوں اور شہسواری سے متعلق اس کے مذکورہ دلائل نہایت ضعیف تھے جو ناقابل اطمینان ہیں۔ لیکن میں اپنی بابت بتا دوں کہ نجانے وہ کون سا لمحہ تھا جب مجھے ایک ''شاعر'' کا خطاب ملا۔ اس لئے میں مجبور ہوں کہ شاعری کا دفاع کروں جسے میں اپنی تمام تر نیک نیتی کے ساتھ سرانجام دوں۔ تو آپ پر لازم ہے کہ میری اس کاوش کو سراہیں اور اس کی ستائش کریں کیونکہ اس دانا کی بخشش ضرور کی جاتی ہے جو اپنے استاد کے نقش قدم پر چلے۔ دیگر علوم وفنون کے دانشور اپنے علم وفن کا دفاع کرنا اپنا استحقاق سمجھتے ہیں اسی مصداق میں بھی بطور شاعر، شاعری کا دفاع کرنا اپنا استحقاق سمجھتا ہوں۔ کچھ دانشور خاصے ناشکرے واقع ہیں جو شاعری کی مخالفت میں دن رات لگے رہتے ہیں اور اسے بدنام کرنے کی سعی کر رہے ہیں۔ شاعری تو جہالت کی تاریکیوں میں علم کی روشنی ہے۔ اس کی مثال اس دایہ کی ہے جو اپنے دودھ کے ذریعے دیگر علوم وفنون کو طاقت بخشتی ہے۔ جبکہ شاعری کے مخالفین کی مثال اس خار پشت (سیہہ) کی ہے جو تالاب پہنچتے ہی اپنے ہی میزبان کو بھگا دینے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ ان کی

گل اکبر خان

مثال وائپر (viper) نامی سانپ کی ہے جس کی پیدائش پر اس کی ماں مر جاتی ہے۔

یونان کی قدیم تاریخ میں مختلف علوم و فنون کے ماہرین اور فلاسفہ مثلاً ماویس، ہومر، ہیسوڈ، اور فیوز اور لائی نس اعلیٰ پائے کے شاعر تھے جن کی قدامت مسلم ہے۔ یہ وہی دانا ہیں جو علم و فن میں اولیت کے درجے پر فائز ہیں جو آنے والی تمام نسلوں کے لئے قابل تقلید نمونہ ہیں یہاں تک کہ غیر مہذب دنیا کے لوگ بھی ان کے علم و فن کے قدر دان تھے۔

نام ور شاعر افیون سے متعلق تاریخ شاہد ہے کہ ان کی شاعری میں کمال درجے کا سحر پوشیدہ تھا جسے سن کر قوی سے قوی چٹانیں اپنی اپنی جگہوں سے سرک جاتی تھیں۔ (Thabes) تھیبز کا مشہور محل اسی طرح تعمیر ہوا تھا۔ اور فیوز نے اپنی شاعری کے ذریعے پتھر دل رکھنے والے وحشیوں کو آہنی شاعری اور علم و ہنر سے آراستہ کیا۔

رومیوں میں لیوس اینڈرونیکس اور ای نیوس جیسے علم و فن کے دانشور دراصل شعرا ہی تھے۔ اطالوی زبان کے علمی خزانے کو بھرنے والے مثلاً دنتے، پیٹرارک اور بوکیشیو اعلیٰ درجے کے شعرا تھے۔

ہماری زبان میں گاور اور چاسر جیسے نامور شعرا نے علم و فن کے خزینے بھر دیئے جن پر انگریز قوم بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ یونان کے فلسفی فطری طور سے اعلیٰ درجے کے شعرا تھے۔ تھیلز، ایمپی ڈوکلس اور پارمینڈس جیسے اعلیٰ پائے کے فلسفیوں نے اپنا اپنا فلسفہ شعر و شاعری کی صورت میں دنیا کے سامنے پیش کیا۔ فیثا غورث اور نوسیلیڈس کے فلسفوں پر بھی شاعری کا رنگ غالب ہے۔ ٹائرنائس کے جنگی قوانین ہوں یا سولن کی پالیسی سازی ہو، ہر دو شعری فطرت میں رنگے ہوئے ہیں۔ عقلمند سولن ایک اعلیٰ درجے کے شاعر تھے جنہوں نے بحر اوقیانوس کی کہانی شعری رنگ میں پیش کیا جس پر بعد میں افلاطون نے اپنی فکری بنیادیں اٹھائیں۔ افلاطون خود بھی اپنے دامن کو شعری فطرت سے بچا نہ پائے۔ ایتھنز کی اکثریت ان کی شاگرد رہی ہے۔ اگر اس نے کسی کو تعلیم دینے کے بجائے اسے کسی طاقچے میں رکھا ہوتا تو آج اس کا اتنا بڑا نام علم و فن کی دنیا میں زندہ نہ ہوتا۔ انہوں نے اپنے علم و فن میں شعری فطرت کی خوب عکاسی کی ہے۔ یونان میں اٹھنے بیٹھنے کے طور طریقے ہوں یا کسی دعوت و ضیافت کے اصول یا گیگز کی انگوٹھی (Gyges Ring) جیسی کہانی ہو، ان سب میں شعری فطرت کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ یہ سب اپالو کے باغ کے مختلف پھول ہیں۔

مورخین نے بھی اپنی اپنی تاریخیں شعری فطرت کے تاثر سے مرتب کی ہیں۔ ہیروڈوٹس نے اپنے تاریخی فن پارے کی ابتدا نو میوزوں (Nine Muses) سے کی ہے جس کی تقلید میں بعد میں آنے والے تمام تر مورخین نے یہی اسلوب تحریر اپنایا حتیٰ کہ تواریخ میں بادشاہوں اور جنگ کے سپہ سالاروں کی زبانی لمبی لمبی تقاریر اور خطابات میں بھی شعری فطرت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ اس لئے یہ اعلیٰ درجے کے شعرا کہلائے۔

☆☆☆☆☆

''علامہ اقبال ایونیو'': نیویارک میں شاعر مشرق کو خراج تحسین

جیسے ہی پاکستان 14 اگست کو اپنا 76 واں یوم آزادی منانے کی تیاری کر رہا ہے، امریکہ کے سب سے بڑے اور مشہور شہری مرکز نیویارک شہر کی ہلچل سے بھرپور سڑکوں پر ایک دلچسپ پیش رفت ہوئی ہے۔ نیو یارک کے راستوں میں سے ایک راستے کو ایک اضافی مانیکر سے نوازا گیا ہے، جس نے اسے ''علامہ اقبال ایونیو'' میں تبدیل کر دیا ہے۔ یہ یادگاری عمل نہ صرف پاکستان کی تاریخ کی ایک قابل احترام شخصیت کو خراج عقیدت پیش کرتا ہے بلکہ مستقبل میں پاکستان اور امریکہ کے درمیان مضبوط رشتے کو فروغ دینے کا کام بھی کرے گا۔

شاعر مشرق علامہ اقبال پاکستانیوں کے لیے خوابوں کی تعبیر کا محرک ہیں، بصیرت افکار اور قومی جذبے کا مترادف نام ڈاکٹر علامہ اقبال ایک ایسا آئیکن ہیں جن کی اہمیت پاکستان کی سرحدوں سے بھی باہر گونجتی ہے۔ وہ ادب، فلسفہ، اور سیاسی گفتگو کے دائرے میں اپنی انمٹ شراکت کے لیے مشہور ہیں۔ مزید قابل ذکر بات یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ وطن کی اقبال کی خوابیدہ خواہش 1947 میں پاکستان کے قیام پر منتج ہوئی، جس نے ملک کے ارتقا میں ایک اہم شخصیت کے طور پر ان کی حیثیت کو مستحکم کیا۔

نیویارک شہر میں علامہ اقبال کے اعزاز میں ایک گلی کا نام تبدیل کرنے کی کوشش علی راشد کی محنت اور کوششوں سے عمل میں آئی، جو امریکن -پاکستانی ایڈووکیسی

رحمت عزیز خان

گروپ کے سربراہ ہیں۔ اس اہم فیصلے کو سفیر پاکستان مسعود خان نے بھی سراہا ہے، جنہوں نے اس اقدام کو پاکستان اور امریکہ کے درمیان سفارتی تعلقات کو تقویت دینے کے لیے ایک مضبوط پل کے طور پر سراہا۔ ''علامہ اقبال ایونیو'' کا نام تبدیل کر کے ثقافتی تبادلے اور یکجہتی کی علامت کے طور پر کھڑا کیا گیا ہے، جو نہ صرف پاکستانی نژاد امریکیوں میں بلکہ پوری امریکی آبادی میں فخر کے احساس کو بڑھاتا ہے۔

پاکستان اور امریکہ کے درمیان بہتر تعلقات کو فروغ دینے کے لیے علی راشد کی لگن نام کے دائرے سے باہر ہے۔ انہوں نے امریکی عوام کو پاکستان کی کثیر جہتی تاریخ اور متحرک ثقافتی تاریخ کے بارے میں روشناس کرانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ راشد اور امریکن پاکستانی ایڈووکیسی گروپ کی انتھک کوششوں سے، امریکی ایوان نمائندگان نے 23 مارچ 2023 کو ''یوم پاکستان'' کے طور پر منانے کا اعلان کیا، اس طرح دونوں ممالک کے درمیان باہمی افہام وتفہیم اور تعلق کو مزید تقویت ملی۔

رچمنڈ ہل، کوئنز، نیویارک میں 109 اسٹریٹ اور 101 ایونیو کا نام ''علامہ اقبال ایونیو'' کے نام سے تبدیل کرنا پاکستان کے شاندار ورثے کی گہری پہچان اور پاکستانی نژاد امریکیوں کے لیے اپنے وطن کے ایک قابل احترام رہنما کو خراج عقیدت پیش کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ واشنگٹن میں پاکستانی سفارتخانے سے جاری ہونے والا یہ اعلان علامہ اقبال کے نظریات اور اقدار کی دیرپا افکار وخیالات کی نشاندہی کرتا ہے، جو نیویارک شہر میں متحرک پاکستانی کمیونٹی میں مسلسل گونجتے رہتے ہیں۔ نیو یارک سٹی کونسل کی سپیکر ایڈرین ایڈمز کا کہنا تھا: ''علامہ اقبال کی میراث نیویارک شہر میں فعال پاکستانی کمیونٹی میں موجود ہے، جس نے شہر کی ثقافت میں اضافہ کیا ہے۔'' نیویارک سٹی کی ایک سڑک کا ''علامہ اقبال ایونیو'' کے نام سے نام رکھنا محض ایک اعزازی عمل نہیں ہے۔ یہ دونوں ممالک کے درمیان ثقافتی تعلق، سفارت کاری، اور پاکستانیوں اور امریکی حکومت کے ناقابل تسخیر جذبے کی طاقت کی علامت ہے۔ جیسا کہ پاکستان اپنے یوم آزادی کو منانے کے لیے تیار ہو رہا ہے، یہ اشارہ ماضی اور حال، ثقافت اور سفارت کاری اور مشترکہ تاریخ اور امنگوں کے ذریعے متحد دو قوموں کے درمیان ایک مضبوط پل کا کردار ادا کرے گا۔ علامہ اقبال کی شاعری، علمی، ادبی اور فلسفیانہ خدمات نہ صرف تاریخ کی کتابوں میں بلکہ نیویارک شہر کے ہلچل سے بھرے دل میں بھی پروان چڑھتی رہیں گی۔

☆☆☆☆☆

منٹو کی افسانہ نگاری اور ایک ''آم'' سا افسانہ

سعادت حسن منٹو اردو ادب کا ایسا افسانہ نگار ہے، جسے اپنے منفرد اسلوب کی وجہ سے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی تحریریں آج بھی اتنی ہی تازہ اور جاندار ہیں، جتنی برسوں پہلے تھیں۔ اس لیے کہ زمانے نے ظاہری ترقی تو کی ہے مگر اس کے باطن کی اچھائیاں و برائیاں ویسی ہی ہیں۔ وہ اندر سے نہیں بدلا۔ یعنی انسانی رویے ویسے کے ویسے ہیں۔ منٹو بطور افسانہ نگار اپنا کام خوش اسلوبی سے نبھا گئے اور زندگی کی ان تلخ حقیقتوں کو بے نقاب کر گئے، جن پر قلم اٹھاتے ہوئے لوگ ڈرتے ہیں۔ منٹو اپنے افسانوں میں عام انسان کی بات کرتا نظر آتا ہے۔ عام انسان مطلب اکثریت۔ ظاہر ہے محروم طبقہ ہمیشہ اکثریت میں ہوتا ہے اور یہی محروم و مجبور طبقہ منٹو کے افسانوں میں ہمیں نظر آتا ہے۔ منٹو کو برصغیر میں جدید افسانے کا بانی کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ کیونکہ اس سے پہلے کا ادب یا افسانہ تخیلاتی ہوتا تھا۔ منٹو نے تخلیقی ادب کا آغاز کیا اور اس میں حقیقت کا رنگ بھر دیا۔ سادہ اسلوب کے ساتھ نفسیاتی مسائل کو اجاگر کر کے منٹو نے اپنے افسانوں کا تعلق براہ راست زندگی کے ساتھ رکھا ہے۔ اس لیے وہ سیاسی ادب کی بجائے انسانی انقلاب کا قائل نظر آتا ہے۔ ممتاز محقق، فکشن نگار اور ناقد مبین مرزا اپنی مشہور کتاب ''سعادت حسن منٹو: شخصیت اور فن'' کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں۔ ''مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ اگر اردو افسانے کی تاریخ میں منٹو پیدا نہ ہوتا تو اردو افسانہ جہاں آج ہے اور جیسا ہے، نہ وہاں ہوتا اور نہ ہی ویسا ہوتا۔ اردو افسانے پر منٹو کے اثرات فکری بھی ہیں، تخلیقی اور فنی بھی۔ منٹو کی فن کارانہ حیثیت اور تخلیقی مرتبے کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے انتقال کے نصف صدی بعد ---- یعنی آج بھی فنی اور فکری دونوں اعتبار سے ہمارے ادب اور

رانا محمد شاہد

معاشرے سے ایک زندہ اور معنی خیز relevence رکھتا ہے۔ موجودہ دور کی ہولناک تیز رفتاری اور اس کے ساتھ انسانی زندگی میں بڑھتی ہوئی میکانیت جو اصلا ثقافتوں اور ان کے اوضاع کو غارت کرنے پر کمر بستہ نظر آتی ہے اور ادب وفن کی طرف جس کا معاندانہ رویہ ڈھکا چھپا نہیں اور جو انسانوں سے سوچنے اور غور کرنے کی عادت چھڑا کر انہیں روبوٹ بنانے اور محض وجودی زندگی بسر کرنے کا عادی بنانے کے لیے کوشاں ہے۔ ایسے دور میں بھی کسی ادیب کا اپنے فکری اور تخلیقی حوالوں کے ساتھ اپنی موجودہ موت کے ساٹھ برس بعد بھی اس طرح زندہ اور relevent رہنا اس حقیقت کا بین ثبوت ہے کہ اس نے صرف اپنے زمانے ہی کو نہیں بلکہ آنے والے زمانوں کو بھی سوچا تھا اور یہ کہ اس نے اپنے فن میں ان موضوعات اور مسائل ہی سے سروکار رکھا جو حیات انسانی میں دیرپا اہمیت کے حامل ہیں۔"

منٹو کے شاہکار افسانے کسی مصور کے عظیم فن پارے سے کم نہیں۔ یقیناً منٹو اگر افسانہ نگار نہ ہوتے تو ایک بڑے مصور ہوتے۔ سعادت حسن منٹو اپنے افسانوں میں ایک بے رحم حقیقت نگار تھے۔ جو اپنے افسانوں میں معاشرے کی ان حقیقتوں کا پردہ چاک کرتے رہتے تھے، جن پر بات کرتے ہوئے عموما لوگ گھبراتے ہیں۔ شاید یہی وہ حقیقت نگاری تھی۔ جس نے انہیں انفرادیت عطا کی اور نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزرنے کے باوجود ان کا تخلیقی مقام و مرتبہ برقرار رہا۔ منٹو نے اپنے تجربات سے اپنی تخلیق کا مواد حاصل کیا اور اپنے مشاہدات میں حقیقت کا رنگ بھرا۔ عبداللہ حسین نے ایک بار اپنے تخلیقی تجربے کے حوالے سے کہا تھا "۔ مجھ میں تخیل کی کمی ہے۔ میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ میں گھر بیٹھے آرام دہ کرسی پر لیٹے لیٹے ایسی چیزوں کی مدد سے کہانی گھڑ لوں، جنہیں میں نے کبھی سونگھا، چکھا، دیکھا یا چھوا نہ ہو"۔ منٹو کی افسانہ نگاری کی منفرد حیثیت کو مخالفین نے بھی تسلیم کیا۔ انہوں نے افسانہ نگاری کو ایک نئی جہت سے روشناس کرایا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو وہ ایک معمار افسانہ نویس تھے۔ منٹو نے کہا تھا کہ میں افسانہ نہیں لکھتا، افسانہ مجھے لکھتا ہے۔ انہوں نے یہ بات جس بھی تناظر میں کہی تھی، حقیقت یہ ہے کہ منٹو کی اپنی زندگی بھی بیماری، جدوجہد اور ناقدری کی المناک کہانی تھی۔ منٹو کے ساتھ بھی وہی کچھ ہوا جو ہر بڑے تخلیق کار کے ساتھ ہوتا آیا ہے۔ آج ہم منٹو کو خوب یاد کرتے ہیں۔

انہیں یاد کرنے کے لیے تقریبات منعقد کی جاتی ہیں۔ان پر مذاکرے ہوتے ہیں۔ اخبارات ورسائل میں مضامین لکھے جاتے ہیں۔ ان کی کہانیوں پر تجزیے پیش کیے جاتے ہیں۔ان کی شخصیت کے بہت سے پہلوؤں کو اجاگر کیا جاتا ہے اور اب تو ان پر فلمیں بھی بن رہی ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کی زندگی میں ہمیں ان کی قدر و قیمت کا احساس نہ ہوا۔انہیں زندگی میں وہ مقام نہیں دیا گیا۔جس کے وہ حقدار تھے۔

منٹو بنیادی طور پر افسانہ نگار تھے۔یہ سچ ہے کہ انہوں نے اردو ادب کی دیگر اصناف ڈرامے، مضامین، خاکے، انشائیے بھی لکھے۔ مگر ان کی پہچان افسانہ نگاری ہی بنی۔اسی سے انہیں شہرت اور عزت ملی۔منٹو کے افسانے محض واقعاتی نہ تھے۔بلکہ ان افسانوں میں معاشرتی ناانصافی اور تضادات کی عجیب وغریب دنیا دیکھنے کو ملتی ہے۔ایک ایسی دنیا جس کے کردار ہمارے آس پاس موجود تھے۔ مگر ہم ان کا نام لیتے یا ذکر کرتے ڈرتے ہیں۔منٹو نے ان تضادات اور منافقت کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔انہوں نے افسانہ نگاری کے لیے منفرد موضوعات کا انتخاب کیا۔یہی وجہ تھی کہ انہیں وہ پذیرائی ملی جو کسی دوسرے افسانہ نگار کے حصے میں نہ آئی۔وہ انسان اور انسانی قدروں کے نقاد تھے۔انہوں نے اپنے خیالات، تجربات اور مشاہدات کو بے باک انداز میں اور روایات سے ہٹ کر لکھا۔منٹو کے افسانوں پر فحش نگاری کے الزامات لگے۔ریاستی اداروں کی طرف سے ان پر پابندیاں لگائی گئیں مگر وہ لکھتے رہے۔ایک موقع پر انہوں نے کہا۔

''اگر میری تحریروں کو برداشت نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ زمانہ ناقابل برداشت ہے۔میں تہذیب و تمدن اور سوسائٹی کے کپڑے کیا اتاروں گا، جو ہے ہی ننگی۔میں اسے کپڑے پہنانے کی کوشش بھی نہیں کرتا۔اس لیے کہ یہ میرا نہیں درزیوں کا کام ہے''۔

بعض افسانے اتنے مقبول نہیں ہوتے۔ مگر جب آپ انہیں پڑھتے ہیں تو معاشرے کا الگ ہی رنگ دکھا رہے ہوتے ہیں۔وہ مقبولیت سے زیادہ اہمیت اختیار کر جاتے ہیں۔میں نے منٹو کے مشہور افسانے ابھی تک نہیں پڑھے،تاہم ایک میگزین میں ''آم'' کے عنوان سے ان کا ایک افسانہ پڑھا، جو مجھے بہت خاص لگا۔بلکہ اگر یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ ''آم'' پڑھتے ہوئے مجھے اس حقیقت کا ادراک ہوا کہ سعادت حسن منٹو کو افسانے کا بادشاہ کیوں کہا جاتا ہے۔مجھے یاد ہے کچھ عرصہ پہلے یہ افسانہ

پڑھنے کے بعد میگزین کے صفحے کے نیچے درج بالا جملہ لکھا اور یہ بھی کہ جلد اس افسانے پر کچھ لکھوں گا۔

منٹو کا افسانہ ''آم'' پڑھتے ہوئے بخوبی احساس ہوا کہ منٹو گلی، محلوں میں رہنے والے عام، غریب لوگوں کی کہانیوں کے مصنف تھے۔ سعادت حسن منٹو نے اپنے اس افسانے میں ایک غریب سرکاری ملازم کی کہانی بیان کی ہے۔ جو غریب ضرور ہے مگر بے حد وضع دار، سادہ اور حلیم طبعیت ہے۔ اسے دوسروں کی خدمت کر کے تسکین ملتی ہے۔ وہ 50 روپے ملنے والی پینشن سے مہینے بھر گزارہ کرتا ہے۔ بیوی اور ایک بڑی لڑکی، جو شادی کے ایک سال بعد بیوہ ہو گئی تھی، کے ساتھ رہتا ہے۔ اس تنگ دستی کی وجہ سے گزارہ نہیں ہو پاتا تو تب بیوی کا زیور کام آتا ہے۔ جب سے ریٹائر ہوا ہے۔ پینشن ختم ہونے کے بعد بیوی کا زیور ہی اس کا سہارا بنتا ہے۔ غربت کے باوجود خدمت گزاری اور جس سے محبت ہو، اس کے لیے کچھ کر گزرنے کا جذبہ اس شخص میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ جو غریب ہونے کے باوجود بڑے دل کا مالک ہے۔ مگر ان بڑے لوگوں کو اس کی ذات اور جذباتی مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں۔ افسانے کا اہم پہلو یہ ہے کہ وہ غریب شخص دوسروں کی خواہشات پوری کرنے کے لیے اپنی ذات کی نفی کر دیتا ہے۔ ''آم'' کا یہ مرکزی کردار منشی کریم بخش کا ہے۔ کہانی اسی کے گرد گھومتی ہے۔ منشی کریم بخش نامی یہ شخص جب بھی پنشن لینے جاتا ہے تو خزانے کے بڑے افسر سے ضرور ملتا ہے۔ اس لیے کہ یہ نوجوان لڑکا اس کے ایک مربی و مہربان جج کا بیٹا تھا۔ اس بوڑھے شخص یعنی منشی کریم بخش کے خاص آدمیوں میں ایک یہ لڑکا اور دوسرے ایک افسر (ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ) جو ریٹائرمنٹ کے بعد اپنی کوٹھی میں زندگی کے باقی دن گزار رہی ہیں، شامل ہیں۔ اس نے ان دونوں افراد سے کہہ رکھا ہے کہ اس کے آم کے باغات ہیں، جہاں سے وہ ہر سال انہیں آم کا ایک ٹوکرا بھیجتا ہے۔ بلکہ اب تو یہ دونوں شخص بطور خاص اپنے مہربان بزرگ سے (آموں کے سیزن پر) آم کی فرمائش کرتے۔ منشی کریم بخش ہر سال ان کی یہ فرمائش پوری کر کے اپنے جذبات کی تسکین کرتا۔ مختصر یہ کہ یہی آم اس کی موت کی وجہ بنے تو اس نے آخری لمحات میں اپنی بیوی کو پاس بلا کر کہا" دیکھو میری موت کے بعد کسی کو معلوم نہ ہو کہ ہمارے باغ نہیں ہیں اور یہ کہ ہم بازار سے آم خرید کر بھیجتے تھے اور دیکھو میں مر جاؤں تو چھوٹے جج صاحب اور ڈپٹی صاحب کو میرے مرنے کی

اطلاع ضرور بھیجنا۔اس کی وصیت کے مطابق اس کے مرنے کی اطلاع دونوں خاص افراد کو بھیج دی گئی۔ مگر وہ ناگزیر وجوہات کی وجہ سے جنازے میں شرکت نہ کر سکے۔

سعادت حسن منٹو نے اپنے اس افسانے میں ایک تلخ حقیقت کا ادراک کیا ہے اور وہ یہ کہ عام غریب لوگ اپنی ضرورتوں و مجبوریوں کو بالائے طاق رکھ کر بااثر و امیر لوگوں کی جتنی بھی خدمت کر لیں، ان بڑے لوگوں کے پاس غریبوں کے اندر جھانکنے کا وقت نہیں ہوتا اور جب وہ زندگی میں ہی ان کا احساس نہ کر سکیں تو مرنے پہ جنازے میں کیا شریک ہوں گے۔ منٹو نے ہی ایک بار کہا تھا۔ ''اگر آپ کی زندگی درد کے احساس کے بغیر گزری ہے تو شاید آپ ابھی تک پیدا ہی نہیں ہوئے۔''

منشی کریم بخش کے اس کردار میں قاری کو آم کی طرح میٹھی اور شیریں محبت بھی ملے گی، جو وہ چھوٹے جج صاحب اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے لیے رکھتے تھے۔ چنانچہ ایسے ہی مواقع پر وہ پہلے خزانے والے افسر کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔ ''چھوٹے جج صاحب اس دفعہ ایسے تحفہ آم ہوں گے کہ آپ کی طبعیت خوش ہو جائیگی۔ ملائی اور شہد کے گھونٹ نہ ہوئے تو میرا ذمہ۔ میں نے لکھ دیا ہے کہ چھوٹے جج صاحب کے لیے ٹوکرا خاص طور پر بھروا دیا جائے اور سواری گاڑی سے بھیجا جائے۔ تاکہ جلدی اور احتیاط سے پہنچے۔ دوسری جگہ جب ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سے گفتگو میں کبھی کبھی منشی کریم بخش کے آم کے باغات کا ذکر آ جاتا تو ڈپٹی صاحب کہتے ''منشی صاحب! اب کی دفعہ فصل کیسی رہے گی''۔ پھر چلتے چلتے ڈپٹی صاحب خود ہی کہتے ''پچھلے سال آپ نے جو آم بھجوائے تھے۔ بہت اچھے تھے، بے حد لذیذ تھے۔ اس پر منشی کریم بخش کہتا ''ان شاء اللہ خدا کے حکم سے اب کی دفعہ بھی ایسے ہی آم حاضر کروں گا۔ ایک ہی بوٹے کے ہوں گے۔ ویسے ہی لذیذ بلکہ پہلے سے کچھ بڑھ چڑھ کر ہی ہوں گے''۔ ان دونوں افراد کو منشی کریم بخش ہر سال آم کا ٹوکرا بھیجا کرتا تھا۔ اور اس میں آم کی لذت و مٹھاس سے زیادہ منشی صاحب کی اپنی لذت و مٹھاس شامل ہوتی تھی۔ وہ محبت اور مٹھاس جو آج معاشرے میں اگر ناپید نہیں تو کم یاب ضرور ہے۔ مگر افسانے کی تلخ حقیقت یہ ہے کہ اس محبت و مٹھاس کا جواب اتنی ہی درشتی، بے رحمی اور سفاکیت سے ملتا ہے۔ منٹو نے اسی سفاکیت کو بڑی بے باکی سے بے نقاب کیا ہے۔ ''منشی کریم بخش کی موت سے چھوٹے جج صاحب اور ڈپٹی

صاحب کو مطلع کر دیا گیا مگر دونوں ناگزیر مجبوریوں کے باعث جنازے میں شرکت نہ کر سکے"۔ اس فقرے سے ہی وہ سفاکیت اور تلخی محسوس ہو رہی ہے، جو مصنف قاری کو دکھانا چاہتا ہے۔

اس افسانے کا بے ساختہ پن اسے فطری اور موثر بناتا ہے۔ سیدھے سادے اور رواں جملوں کے ساتھ مصنف نے عام بول چال کی زبان استعمال کرتے ہوئے اپنے قاری کی توجہ ادھر ادھر نہیں ہونے دی۔ مشکل الفاظ اور نامانوس تراکیب کا استعمال منٹو بہت کم کرتے تھے۔ یعنی یہ تکلف ان کی زندگی میں تھا اور نہ ہی طرز اظہار میں۔ ہلکا پھلکا اور بے ساختہ پن ہی منٹو کے افسانوں کی انفرادیت تھا۔ منٹو جو محسوس کرتے تھے، اسے بڑی سہولت سے بیان کر دیتے تھے۔ ان کا مشاہدہ اتنا باریک ہے کہ وہ معمولی جزیات کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ جیسے اس افسانے میں آموں کی حفاظت کا ذکر کرتے ہوئے منٹو لکھتے ہیں "دونوں ٹوکرے غسل خانے میں ٹھنڈی جگہ رکھ دیئے گئے۔ تاکہ آم خراب نہ ہوں۔ ادھر سے مطمئن ہو کر دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد منشی کریم بخش چارپائی پر لیٹ گیا"۔ آگے چل کر وہ لکھتے ہیں "وہ گرمیوں میں عام طور پر غسل خانے کے اندر ٹھنڈے فرش پر چٹائی بچھا کر لیٹا کرتا تھا۔ یہاں موری کے رستے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا بھی آ جاتی تھی۔ لیکن اب کے اس میں دو بڑے بڑے ٹوکرے پڑے تھے"۔۔۔۔ اور یوں منٹو قاری کو اپنی کہانی کی جزیات میں جذب کر لیتا تھا۔ منٹو کے اسلوب کی یہ تاثیر اور جادو بیانی قاری کو ایک تازگی عطا کرتی ہے۔ ایک نئے انداز سے سوچنے کی صلاحیت عطا کرتی ہے۔ چنانچہ منٹو کا یہ مقناطیسی انداز قاری کو اپنے افسانے کے سحر کے ساتھ جوڑے رکھتا ہے۔ سعادت حسن منٹو کا یہ افسانہ بہت دل فگار ہے۔ غم زدہ کر دینے والا ہے۔ تاہم اس افسانے کو اگر ایک جملہ عطا کیا جائے تو یہی ہوگا کہ "غریب کا دل بڑا ہوتا ہے"۔

منٹو کے افسانوں میں حساسیت اور جذباتیت کا گہرا رنگ جھلکتا ہے۔ وہ نچلے طبقے کے لوگوں سے محبت اور اپنائیت کا تعلق رکھتے تھے۔ شاید اس لیے کہ اس طبقے کے معاملات و مسائل، ناآسودگیوں اور پس پردہ عوامل سے آگاہ تھے اور ان معاشرتی ناہمواریوں سے بھی آگاہ تھے، جو عام آدمی کو پیش آتی ہیں۔ گرے پڑے اور پسے طبقات ان کے افسانوں کا موضوع ہوتا تھا۔ انہیں ان محروم لوگوں میں سچائی، صاف گوئی، دردمندی اور انسان دوستی نظر آتی

تھی۔ جیسا کہ ''آم'' کے مرکزی کردار منشی کریم بخش میں وہ سب کچھ نظر آتا ہے۔ سادگی اور سچائی۔ منٹو عام آدمی اور بڑے آدمی کے اندر چھپی اچھائی اور برائی سے اچھی طرح آگاہ تھے۔ دوسرے الفاظ میں وہ انسان کی فطری کمزوریوں اور پستیوں کو بخوبی جانتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ''آم'' میں انہوں نے جہاں منشی جیسا سیدھا سادہ اور وضع دار کردار دکھایا، وہیں چھوٹے جج اور سپرنٹنڈنٹ جیسے پست لوگوں کی ذہنیت کو بھی آشکار کیا۔ جنہیں عام آدمی کے احساسات و جذبات سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ان امیرزادوں کے لیے عام آدمی کا جینا مرنا بے معنی ہے۔ انہیں اگر غرض ہے تو اپنے مفادات سے۔ ہمارے سرکاری محکموں کی افسر شاہی کو دیکھیں تو بھی منٹو کے اس افسانے کی حقیقت بخوبی عیاں ہو جائے گی۔ ''آم میں منٹو نے جہاں منشی کریم بخش کی مفلسی کا نقشہ کھینچا ہے، وہیں چھوٹے جج اور ڈپٹی صاحب کی بے حسی کو بھی ہمارے سماج کے ایک ایسے رنگ کے طور پر پیش کیا ہے۔ جس کی جھلک ہمیں اکثر دیکھنے کو ملتی ہے۔ منشی کریم بخش اپنی تنگدستی، فاقہ کشی اور دکھ بھری زندگی کے باوجود امیرزادوں سے محبت رکھتا ہے۔ اس میں مصنف نے طبقاتی تقسیم اور طبقاتی سوچ کے فرق کو بھی نمایاں کیا ہے۔ یعنی امیر اور غریب کی سوچ کا فرق۔

''آم'' پڑھتے ہوئے مجھے معاشرے کا ایک سیاسی پہلو بھی نظر آیا۔ ہمارے سیاستدان بہت زیادہ مصروفیات کے باوجود عام لوگوں کے جنازوں میں بھی شرکت کرتے ہیں، جب الیکشن قریب ہوں۔ ان کی ہر طرح سے دلجوئی کرتے ہیں تاکہ اپنے مقصد یعنی الیکشن میں کامیاب ہوں۔ ورنہ عام حالات میں تو عام آدمی کو خود روند دیتے ہیں۔ ان کے جذبات و احساسات کو کچل کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔

منٹو کے اس افسانے کے مکالمے فطری اور کرداروں کے عین مطابق ہیں۔ افسانے کا عنوان بھی دلچسپ ہے۔ قاری افسانہ پڑھنے کے بعد عنوان پر نظر ڈالتا ہے تو لکھنے والے کو داد دیئے بغیر نہیں رہتا۔ اس لیے کہ یہ عنوان پوری کہانی کا ترجمان ہے۔ سعادت حسن منٹو کا یہ افسانہ مصنف کی نفسیات پر گرفت اور قوت مشاہدہ کا بھرپور ترجمان ہے۔ آخر میں یہی کہوں گا کہ منٹو کا یہ ایک ''آم''۔۔۔۔۔ میرا مطلب عام سا افسانہ ہے، مگر میرے لیے بہت خاص ہے کہ یہی وہ افسانہ ہے جس نے منٹو کے افسانے پڑھنے کی بنیاد رکھی۔

☆☆☆☆☆

مولانا جلال الدین رومیؒ

آپ کا نام محمد لقب جلال الدین ہے عرفِ عام میں آپ کی شناخت مولانا روم کی ہے۔ آپ حضرت سیدنا ابوبکر صدیقؓ کی اولاد سے ہیں۔ آپ کی ولادت 6 ربیع الاول 604 ہجری بلخ افغانستان کی ہے۔ آپ نے اپنی ابتدائی تعلیم اپنے والد شیخ بہاالدین سے حاصل کی جن کا حلقہء ارادت بہت وسیع تھا۔ مریدوں میں سید برہان الدین بھی شامل تھے جو بہت بڑے محقق اور عالم تھے۔ آپ کے والد نے مولانا روم کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری سید برہان الدین کو سونپی۔ بعد ازاں آپ ترکی کے شہر قونیہ میں اور پھر دمشق کے مدارس سے بھی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ عبد القادر ابن محمد نصر اللہ قرشی کے مطابق: مولانا روم مذاہب کا علم رکھنے والے، بہت بڑی فقیہ، علوم کی جملہ انواع میں مہارت کے ساتھ ساتھ اختلافی مسائل پر مکمل دسترس رکھتے تھے۔

مولانا رومی اس دور میں تشریف لائے جب اسلام شمالی افریقہ تک پھیل چکا تھا اور مسلمان یورپ کے دروازے پر دستک دے رہے تھے۔ برصغیر میں شہاب الدین غوری کی اسلامی حکومت قائم ہو چکی تھی، اسلام کے ثقافتی اثرات دنیا کے بڑے بڑے حصوں میں پھیل چکے تھے لیکن غیر مسلموں نے مسلمانوں کو عقائد کی بحثوں میں الجھا رکھا تھا اور صلیبی جنگوں کی تیاری ہو رہی تھی جبکہ مشرق سے تاتاری حملہ آور ہو رہے تھے اس وقت اللہ رب العزت نے امتِ مسلمہ کو مولانا روم جیسی صاحبِ کشف ہستی عطا کی جنہوں نے اسلام کی ترویج کا کام اس خوبصورتی سے سرانجام دیا کہ اللہ کے فضل و کرم سے اسی صدی کے آخر میں اسلام کے دشمن اسلام کے نام لیوا بن گئے۔ تاتاری حکمران برکا خان نے اسلام قبول کر لیا اور انہوں نے ہی اسلام کی گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔

مولانا روم کے گھرانے پر صوفیانہ رنگ نمایاں تھا جس کی بنیادی وجہ آپ کے والد کا امام غزالی سے متاثر ہو کر ان کا فلسفہ، تحقیق

رانا ساجد فراز

اور روحانی تعلیم اپنے گھر میں بھی رائج کی تھی اور یہ اثر مولانا روم پر بھی واضح دکھائی دیتا۔ جب مولانا کی اپنے والد کے ہمراہ نیشا پور میں حضرت خواجہ فرید الدین عطارؒ سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے حضرت بہاالدین کو فرمایا کہ اس جوہر قابل سے غافل نہ ہونا۔ یہ کہہ کر آپ نے اپنی کتاب اسرارنامہ ننھے رومی کو عطا فرمائی۔

حضرت مولانا روم کا سلسلۂ طریقت آج بھی دنیا کے مختلف ممالک میں موجود ہے آپ کے نام کی نسبت سے بعض جگہ یہ سلسلہ جلالیہ کہلاتا ہے جبکہ شام، مصر، قسطنطنیہ اور مختلف ممالک میں اس کو فرقہ مولویہ کہتے ہیں۔ ان کی محافل میں لوگ ایک ہاتھ سینے پر رکھ کر اور دوسرا ہاتھ پھیلائے ہوئے رقص شروع کر دیتے ہیں۔ رقص میں آگے پیچھے نہیں ہوتے بلکہ ایک جگہ جم کر متصل چکر لگاتے ہیں۔ سماع کے وقت دف اور بنسری بجائی جاتی ہے۔ مولانا روم کو بھی سماع کی مجالس میں کیفیت ہو جاتی تو کئی کئی روز تک ہوش میں نہ آتے۔ راہ چلتے کوئی آواز کانوں میں پڑ جاتی تو مستانہ وار رقص شروع کر دیتے۔ آپ کا یہ معمول تھا کہ وجد کی حالت میں جو لباس پہن رکھا ہوتا تھا، وہ بعد از کیفیت قوالوں کو دے دیتے۔

حضرت شمس تبریز سے ملاقات سے قبل کا دور مولانا کے عالمانہ جاہ وجلال کا دور تھا۔ علمی مناظروں اور مباحث میں رغبت تھی، جب سواری پر نکلتے تو امرا اور طلبا کا جمِ غفیر ہم رکاب ہوتا تھا۔ حضرت شمس تبریز کی ملاقات نے طبیعت میں انقلاب برپا کر دیا، صوفیانہ زندگی کا آغاز ہوا، ہمہ وقت کیف و وجد اور عشق و مستی کا غلبہ رہنا شروع ہو گیا، تنہائی مرغوب ہو گئی۔ درس و تدریس اور افتا کا سلسلہ بالکل معطل نہیں کیا مگر غلبہ تصوف کے باعث یہ سلسلے محدود ہو گئے تھے۔

مولانا کی حضرت شمس تبریز سے پہلی ملاقات ایک حوض کے قریب ہوئی، پاس کچھ کتابیں پڑی تھیں، حضرت تبریز گھومتے پھرتے آئے اور کتابوں کی طرف اشارہ کر کے پوچھا ایں چیست؟ یعنی یہ کیا ہے۔ مولانا نے جواب دیا ایں قیل و قال است، یعنی یہ آپ کے مطلب کی چیزیں نہیں ہیں۔ یہ قیل و قال ہے۔ حضرت شمس تبریز نے کتابیں اٹھا کر حوض میں پھینک دی جس سے مولانا کو بہت صدمہ ہوا اور بولے اے درویش تم نے ایسی چیزیں ضائع کر دی ہیں

جواب کسی طرح نہیں مل سکتیں ان کتابوں میں بہت نادر نکتے تھے تم نے سارا علم ضائع کر دیا حضرت شمس نے یہ سن کر فرمایا لو اگر تمہارا علم ان کتابوں میں ہے تو میں واپس کر دیتا ہوں۔ آپ نے حوض میں ہاتھ ڈالا اور کتابیں خشک حالت میں نکال کر مولانا کے سامنے رکھ دیں۔ مولانا پر سخت حیرت طاری ہو گئی۔ پوچھا ایں چیست؟ حضرت شمس تبریز نے فرمایا ایں حال است، یعنی وہ قیل و قال کا مسئلہ تھا یہ عالم حال کا مسئلہ ہے مولانا یہ کرامت دیکھ کر اسی وقت حضرت شمس تبریزؒ کے حلقہء ارادت میں داخل ہو گئے۔

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم
تا غلامِ شمس تبریزی نہ شد

آپ زہد و قناعت کے پیکر تھے اور عبادت و ریاضت میں مشغول رہتے اور اکثر روزہ سے رہتے تھے۔ آپ انتہائی فراخ دل اور سخی تھے۔ روزانہ شام کو اپنے خادم سے پوچھتے کہ گھر میں سامانِ خورد و نوش یا کوئی مال باقی ہے اگر وہ کہتا کہ ہاں باقی ہے تو فرماتے اس گھر سے نمرود اور شداد کی بو آ رہی ہے، جب خادم یہ جواب دیتا کہ آج گھر میں کچھ نہیں تو خوشی سے فرماتے آج تو گھر سے درویشی کی خوشبو آ رہی ہے۔

حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ کی تاریخ وفات 5 جمادی الثانی 672 ہجری ہے۔ آپ کے وصال سے قبل قونیہ میں بڑے زور کا زلزلہ آیا جس کے جھٹکے 40 روز تک برابر محسوس کیے جاتے رہے۔ لوگ پریشان ہو کر مولانا کے پاس حاضر ہوئے کہ کیا ماجرہ ہے آپ نے فرمایا زمین بھوکی ہے اور تر لقمہ چاہتی ہے ان شاء اللہ کامیاب ہو جائے گی۔ کچھ دن بعد آپ علیل ہو گئے، حضرت صدر الدین آپ کی علالت کو دیکھ کر بے چین ہو گئے اور دعا کی کہ اللہ کریم آپ کو شفا عطا فرمائے۔ مولانا نے فرمایا شفا آپ کو مبارک ہو، عاشق اور معشوق میں بس ایک پیرہن کا پردہ رہ گیا ہے کیا آپ نہیں چاہتے کہ وہ بھی اٹھ جائے اور نور نور میں مل جائے۔ یہ سن کر شیخ صدر الدین آنسو بہاتے واپس چلے گئے اور بعد ازاں شیخ صاحب جب آپ کا جنازہ پڑھانے آئے تو چیخ مار کر بے ہوش ہو گئے، پھر قاضی سراج الدین آ گئے اور نماز پڑھائی۔ آپ کا مزار پرانوار ترکی کے شہر قونیہ میں موجود ہے اور بوسہ گاہِ خلائق و مرکز علم و فضل ہے۔

☆☆☆☆☆

ایک خاموش دانشور کا خاکہ

لاہور آرٹس فورم (LEAF) کے مظفر غفار کو اللہ بڑھاپے کی تکالیف سے محفوظ رکھے، جب تک ماڈل ٹاؤن لائبریری کے اپر پورشن تک جانے کی ہمت رہی، انہوں نے تمام وقت وسائل اور ذہنی کاوشیں صفِ اول کے ادیبوں، شاعروں، آرٹسٹوں اور دیگر فنون لطیفہ کے اساتذہ کو وہاں اور الحمرا کلچرل کمپلیکس (قذافی سٹیڈیم) میں مدعو کرتے اور ان کے لیکچرز کا اہتمام کرتے رہے۔ ایف بلاک ماڈل ٹاؤن لائبریری میں لیکچرز کے ساتھ ہائی ٹی کا اہتمام ہوتا تھا جس سے فیض یاب ہونے کے بعد اکثر ناسمجھ چلے جاتے تھے لیکن ایک فیملی ایسی تھی جو اشتہا انگیز مہک والے سموسوں، لذیذ جلیبیوں اور مشروبات کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھتی اور آخیر تک موجود بھی رہتی۔ کیوں کہ ان کے سربراہ ڈاکٹر ناصر رانا پروگرام کی ریکارڈنگ کر رہے ہوتے تھے۔

درمیانے قد والے، گول مٹول، بارُعب، وجیہہ، پُرکشش اور پُر وقار شعر و ادب، موسیقی و فنون لطیفہ سے رغبت کے باعث وہ سمن آباد سے ماڈل ٹاؤن آکر آڈیو/ویڈیو ریکارڈنگ کی رضا کارانہ ڈیوٹی اُس وقت تک سرانجام دیتے رہے جب تک 'لیف' کے پروگرام جاری رہے۔ بلکہ ان ریکارڈنگز کو "لیف سالنامہ" کے عنوان سے مرتب کر کے شائع بھی کرتے رہے۔ آنکھوں پر نظر کا چشمہ چڑھائے ہاف سلیوز سفاری سوٹ پہنے وہ پہلی نظر ہی میں دانش ور اور مفکر دِکھتے تھے۔

ایسے تہذیبی کردار بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں۔ وہ مختصر اور بامعنی جملوں پر اکتفا کرتے مگر اُن میں اُن کی متوازن شخصیت اور فکر کی جھلک ہمیشہ نمایاں رہتی۔ بطور معاون "ادب لطیف" جب میں نے انہیں ایک شمارہ پیش کیا تو انہوں نے بھی مجھے سہ ماہی "ادب معلیٰ" عطا کیا، جس کے وہ مدیر، بیگم پبلشر، بیٹی فائقہ جنجوعہ نائب مدیر اور دیگر اہل خانہ کارکن کی حیثیت میں اس کی اشاعتی ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے ہیں۔ وہ اپنی فیملی کو "سیلانی گھرانہ" کہتے ہیں لیکن میری نظر میں وہ ایک "ادبی گھرانہ" ہیں۔ اُن کی مقناطیسی شخصیت کی بدولت اُنہیں اُن اہل قلم کا تعاون حاصل ہے جن کی علمی و ادبی استعداد، قابلیت، تجربہ و مہارت کے باعث ان کی معیاری اور قابل مطالعہ نگارشات کو اہل ادب سراہتے ہیں۔ رانا صاحب کے اداریے پڑھے لکھے طبقے کے لیے

شاہد بخاری

جاذب نظر اور تھاٹ پروونگ ہوتے ہیں۔ مواد، نیرنگی مضامین، شعری حسن اور نثری شہ پاروں کی وجہ سے یہ مجلّہ واقعی 'ادبِ معلیٰ' ہے۔

آپ پچھلے اٹھارہ بیس برس سے اردو ادبی مجلّے کے ساتھ ساتھ ایک اعلیٰ سطحی پنجابی تحقیقی اور تنقیدی مجلّہ بھی شائع کر رہے ہیں جس نے پنجابی زبان و ادب کے اس دشوار گزار شعبے میں وقیع کام کیا ہے اور بڑا نام کمایا ہے۔ اُن کو رنگا رنگ تقاریب میں بہت کم دیکھا گیا ہے۔ وہ جس خاموشی کے ساتھ کام کر رہے ہیں وہ کم کم لوگوں کا شعار رہا ہے!

''ادبِ معلیٰ'' ہی کے ذریعے جب معلوم ہوا کہ ڈاکٹر ناصر رانا کالج میں پڑھاتے ہیں تو اُن سے دوستی ہو گئی۔ آپ اُن گنے چنے اساتذہ میں سے ہیں جنھوں نے معلّم کے تشخص کو حرمت اور اعتبار سے ہم کنار کیا۔

آپ ایک وسیع المطالعہ، ابلاغ پر قادر اور شاگردوں کو خود اعتمادی دینے والے چنیدہ اساتذہ میں سے ہیں۔ آپ نے جہاں بھی اور جس بھی کالج میں پڑھایا یا انتظامی ذمہ داریاں نبھائیں، ہر جگہ اپنے شاگردوں کے لیے سرچشمۂ فیض رہے۔ انہوں نے کئی نسلوں کی ذہنی آبیاری کی۔ وہ شاگردوں، کولیگز اور پڑوسیوں کو جوڑ کے رکھنے کی صلاحیت کے انمول مالک ہیں۔ جہاں جہاں بھی وہ رہے، رفقائے کار کو ایک فیملی میں تبدیل کرنے کے لیے کوشاں رہے۔ انہوں نے اس پیغمبری پیشے سے تکریم پائی اور تعظیم حاصل کی۔ وہ گفتار سے نہیں کردار سے نمایاں ہونے والی شخصیت ہیں۔ مَیں نے انہیں نرم دم گفتار اور گرم دم کردار پایا ہے۔ آپ چاہیں تو انہیں نرم دم گفتگو اور گرم دم جستجو بھی کہہ سکتے ہیں۔

آپ نے زمیندار کالج گجرات، ایم اے او کالج، شالیمار کالج اور دیال سنگھ کالج، لاہور میں ہزاروں زندہ دل شاگرد پیدا کیے جو معاشرے کو سجانے سنوارنے کے مشن پر چراغ سے چراغ جلا رہے ہیں۔ ناصر رانا نے شرق پور شریف میں ڈگری کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے اور دوسرے اداروں میں بھی اپنے وابستگان کی زندگیوں میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کیں جو کردار سازی کے اعلیٰ معیار کی گواہ ہیں۔ اس کے باعث وہ خود کو قوم و ملت کا مقروض خیال کرتے ہیں اور زندگی کی ہر سانس کے ساتھ محبت اور توجہ سے اُن تمام طالب علموں اور کتبوں کی دست گیری کرنا چاہتے ہیں، جو کامیابی کی تمنا رکھتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ ایک بار مجھ سے مشورے کے طالب ہوئے تو مجھے مشتاق احمد یوسفی کا واقعہ یاد آ گیا۔ وہ بتاتے تھے کہ 'G.M' مسٹر جانسن نے مجھ سے مشورے لینے بھی شروع کر دیے اور میرے مشوروں کے برعکس کام کر کے کامیابی حاصل کی۔''

اس دورِ عجیب میں وہ پرنسپل رہے جب کسی بھی تعلیمی ادارے کا سربراہ پل پل ''اوپر'' کی ہدایات کا پابند ہوتا ہے اور اس دور میں کون نہیں جانتا کہ وہ ہدایات تعلیمی مقاصد کے بجائے غیر تعلیمی ترجیحات زیادہ رکھتی ہیں۔ اب ریٹائر تو ہوئے ہیں لیکن کچھ نہ کچھ

کرنے کا جذبہ اُن کے دل میں اب بھی موجزن ہے۔ وہ اُستادوں کے استاد رہے ہیں لیکن چالاک بالکل نہیں ہیں۔ آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ استاد تو ہیں لیکن "بڑے استاد" نہیں۔ وہ شعر کہتے ہیں مگر مشاعرہ نہیں پڑھتے۔ ریڈیو پروگراموں میں جاتے ہیں اور ٹی وی پر دانش وروں کی ٹولیوں میں نظر آتے ہیں لیکن پروگرامرز کی خوشامد نہیں کرتے، اپنی دُنیا میں مست رہتے ہیں۔ پروفیسرز ہی کے حلقہ ارباب سخن میں انہوں نے بہ اصرار افسانہ پڑھا لیکن اپنا کلام نہیں سنانا جو حسبِ روایت قبل از عشائیہ حاضر شاعر سناتے ہیں۔ زاہد ڈار اور شعیب بن عزیز کی طرح وہ اپنے کلام کے بجائے اساتذہ کا کلام سناتے رہتے ہیں۔ اُن کی خود ضبطی کا یہ عالم ہے کہ مجھے اُن کے شاعر ہونے کا علم تب ہوا جب انہوں نے اپنا مجموعہ کلام "تمہیں کو سوچنا ہے" مجھے عطا کیا۔

آپ یاروں کے یار، جواں ہمت اور باشعور شاعر ہیں جو آشوبِ ذات کو آشوبِ زیست سے الگ نہیں جانتے۔ وہ حسن و صداقت اور سادگی و پرکاری کے رنگ و نور سے زندگی کی تخلیق نو کرتے ہیں۔ شاعر وہ ہوتا ہے جو زندگی کے بنیادی آہنگ اور توازن کی تلاش میں ہو۔ ناصر رانا نئے اسلوب اور تلازمات شاعری کے بر جستہ استعمال میں غیر معمولی قدرت رکھتے ہیں۔ بلاشبہ وہ فطری شاعر ہیں۔ ان کے کلام پر درجنوں علما کی آرا اب تک مضامین اور شذروں کی صورت شائع ہو چکی ہیں۔ ڈاکٹر خورشید رضوی نے ان کے کلام کے بارے لکھا ہے کہ "ڈاکٹر ناصر رانا کی سخن گوئی کا اظہار ان کے مجموعے "تمہیں کو سوچنا ہے" میں ہو رہا ہے۔ ان کے ہاں دل کی خانہ خرابی، کوئے یار کی رنگینی و دل کشی، ارمانوں کی فصل، حسن کی فنا، عشق کی بقا اور لپکتے شراروں، نکھرتے نظاروں، رسیلی بہاروں کا منظر نامہ ایک دل کش قوس قزح بناتا ہے۔"

مَیں یہاں اُن کے کچھ اشعار درج کر رہا ہوں، جن سے آپ خود بھی اُن کی فکر کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

اس سے بڑھ کر نہیں معراجِ محبت ناصر
ایک دشمن کو اگر دوست بنایا جائے

لمحے کی توقیر نہ کرنے والے آخر
یاد آئے تو عمروں تک وہ روتے ہیں

لباس اُجلے، دلوں میں کدورتیں کتنی
نظر فریب نظاروں سے دُور اچھا تھا

شامل مرے سخن میں نیا اک رنگ ہے
فکریں نئی، ادب بھی نیا، فلسفہ نیا
تدبیر سے بدلتی جو تقدیرِ دہر میں
پھر کس لیے مَیں سوچتا اِک راستا نیا

مرے پاس تو کچھ اثاثے نہیں تھے
زمانے کے وعدوں قراروں نے لوٹا

اونچا اُڑنا اپنے بل پر
اتنا سا پیغام ہے میرا

جتنے بھی ہیں سچے لوگ
وہ لگتے ہیں اچھے لوگ

☆☆☆☆☆

آم بیتی [انشائیہ]

ایک دن کسی امیر گھرانے میں کھائے گئے آم کی ملاقات ایک غریب گھر میں کھائے گئے آم سے ہوئی---!

پہلے امیر آم اپنا احوال بیان کرتا ہے:-

مجھے بازار سے مہنگے داموں خریدا گیا- گھر پہنچے پر خاتونِ خانہ نے فریج میں رکھ دیا- شام کے وقت مجھے چھوٹے چھوٹے سلائسز میں کاٹ کر فیملی کے سامنے پیش کیا گیا- بچوں نے کانٹے سے کھایا- چھلکے اور گٹھلی کوڑادان میں پھینک دیئے گئے اور میری کہانی ختم---!

امیر آم کا انتہائی مختصر قصہ سن کر غریب آم متعجب ہوا--- اور اپنی روداد سنانے لگا:-

ایک غریب آدمی نے مجھے بہت بھاؤ تاؤ اور جانچ پرکھ کے بعد خریدا- پھل فروش نے مجھے اور میرے تین ساتھیوں کو ایک شاپر میں ڈال کر غریب آدمی کے حوالے کیا- اُس آدمی نے شاپر کو مزید ایک سیاہ تھیلے میں ڈال دیا تاکہ مجھے کسی کی نظر نہ لگ جائے- گھر پہنچے تو ایک بُڑھیا دروازے پر میرے استقبال کے لیے کھڑی تھی- اسے خدشہ تھا کہ بہو یہ نایاب میوہ کہیں اڑا نہ لے جائے-

خیر مجھے ایک ٹوکری میں ڈال کر تاریک کوٹھڑی میں تہ بہ تہ لگی ہوئی چارپائیوں میں سے اوپر والی چارپائی پر رکھ دیا گیا- دوسرے دن دوپہر کو جب فیملی کے سب لوگ اکٹھے ہوئے تو بڑی اماں جان نے ایک بڑا آم چپکے سے کہیں الگ رکھ دیا اور باقی تین آموں کو چھ چھ ٹکڑوں میں کاٹ کر پیش کیا- آم کھاتے ہوئے اُن لوگوں نے میرے بارے میں ایسی باتیں کہیں کہ باخدا میں خود بھی اپنے کمالات سے اتنا آگاہ نہیں تھا-

بچوں کے ابا جان بولے؛ ایسا عمدہ آم سیزن میں کہیں ایک بار ہی آتا ہے- اِس معیار کے آم زیادہ تر برآمد (export) کیے جاتے ہیں-

دادا جان پہلا لقمہ لیتے ہوئے گویا ہوئے: ''بھئی کیا ذائقہ ہے! ایسا لذیذ آم تو واقعی شاذ و نادر دیکھا ہے - ایک دفعہ انیس سو چھیاسی (1986) میں ایسا عمدہ آم کھایا تھا'' اب تو نہ وہ پہلے سا پھل رہا اور نہ وہ کھانے والے---!

ہم لوگ ایک ہی نشست میں ڈھیروں کے ڈھیر آم کھا جاتے تھے، مجال ہے جو ذرا بھی پیٹ خراب ہو- مگر اب کہاں ایسی صحت اور ایسے حالات ----!

تایا جان نے اپنے ابا کی گفتگو سے میرے شجرہ نسب کا اندازہ لگا لیا اور فرمانے لگے: ''ابا جان! ہو نہ ہو یہ اُسی 1986 والے آم کی تیسری نسل ہے- اِس لحاظ سے وہ آم اِس آم کا ''دادا آم'' ہوا ناں---!

تایا جان کی اِس دریافت پر سب نے قہقہہ لگایا- بچوں

حماد ریاض

کے چچا ماسٹر کریم داد جو پندرہ منٹ سے آم کی گٹھلی صاف کر رہے تھے، آم کے فضائل بیان کرنے لگے:-

یہ اولیاء اللہ کی سرزمین ملتان میں پیدا ہوا،
اس پر بزرگوں کی رحمت کا سایہ ہے،
شعرا کو یہ پھل بہت مرغوب ہے۔ غالب نے تو اس پھل کو پھلوں کا بادشاہ کہا ہے۔

اس پر بڑا بیٹا احمد جو گیارہویں جماعت کا طالب علم ہے، فوراً اپنی اردو کی کتاب میں شامل غالب کے آموں سے متعلق لطائف سنانے لگا۔

ماں نے درمیان میں احمد کو ٹوکا: بیٹا خاموشی سے کھاؤ، آم کا رس منہ سے ٹپک رہا ہے جبکہ اکثر وٹامنز اسی رس میں ہوتے ہیں۔

تین سال کی گڑیا جو کہ آم کھاتے ہوئے کچھ حصہ چھلکے کے ساتھ ہی چھوڑتی جا رہی تھی۔ گڑیا کی ماں اپنی ساس کے غضب سے بچنے کے لیے اپنے تیز دھار دانتوں سے اُن چھلکوں کی ایسی صفائی کر رہی تھی کہ اس کے بعد مکھی بھی وہاں سے اپنا حصہ نہ نکال سکے۔

بہو کی اس مشقت کو دیکھتے ہوئے سسر بولے:

بہو رانی! یہ جو تم چھلکے صاف کر کے پھینک رہی ہو، ہمارے زمانے میں تو یہ بھی کھا لیے جاتے تھے۔ اب تو لوگوں کو پھٹ چڑھ گئی ہے ورنہ اصل غذائیت تو اِنھی چھلکوں کے اندر ہے۔ یقین کرو۔۔۔!

یہ سب باتیں ہو رہی تھیں تو ایک بچے نے سوال اٹھا دیا کہ آخر یہ کون سا آم ہے۔ اس کی خاص قسم کو کیا نام دیا گیا ہے۔

تو ابا جان جو بیچارے ان باریکیوں سے چنداں واقف نہیں تھے، ذرا سوچ کر کہنے لگے:

ہاں تو یہ ۔۔۔۔۔! لنگڑا آم ہے نا!

دادی جان جو کہ ایک ٹانگ سے معذور تھیں، جھٹ سے بولیں:-

"اُرے بھئی لنگڑے تو ہم ہیں"

یہ تو اچھا بھلا آم تھا۔ کیوں خدا کی نعمتیں کھا کھا کے ناشکری کرتے ہو! اپنے الفاظ واپس لو اور آم کی روح سے معافی مانگو!

بالآخر ہوا یہ کہ آموں کے چھلکے چوپایوں کو ڈال دیے گئے اور گٹھلیوں پر آ کر دوبارہ بات چیت شروع ہو گئی کہ آخر اس قیمتی قسم اور اعلیٰ نسل کی گٹھلیوں کا کیا کیا جائے۔ بچوں نے کہا کہ یہ ہم زمین میں بوئیں گے اور نیا پودا اگائیں گے۔

مگر دادا جان کو یاد آیا کہ خول کے اندر جو گٹھلی ہوتی ہے اُس کو خشک کر کے پیس لیا جائے تو یہ سفوف دافع اسہال (پیچش) ہے۔ کیوں نہ اس سے دوا بنالی جائے۔۔۔!

خیر۔۔ حتمی فیصلہ یہ ہوا کہ بچوں کا دل بھی رکھا جائے اور بزرگوں کا مان بھی۔۔!

لہٰذا وہ گٹھلیوں کا سفوف بنا لیا گیا اور ایک گٹھلی پچھلی میں بو دی گئی۔

(غریب آم کی یہ گفتگو سن کے امیر آم کو رشک ہو رہا تھا کہ وہ کیوں نہ کسی غریب گھر کا مہمان بنا۔۔۔! کہ وہ یہاں کوڑے دان میں پڑا گل سڑ رہا ہے اور دوسرا نئی زندگی جی رہا ہے)

اور ہاں یاد آیا وہ جو ایک آم خفیہ مقام پر رکھا تھا۔۔۔! تو بے ایمانی کا وہ آم گھر کی ایک سیانی بی نے صبح فجر کے وقت اٹھ کے کھا لیا تھا اور ساتھ ہی نماز فجر ادا کر کے گناہ بخشوا لیا۔۔۔!

اللہ اللہ خیر سلا۔۔۔!

☆☆☆☆☆

بالا پیڈل (موچی) (پنجاب کے گمشدہ کردار)

بالے پیڈل کا اصل نام کیا ہے کسی کو معلوم نہیں، خود بالے کو بھی معلوم نہیں کہ اُسے بالا کیوں کہتے ہیں۔ ہوسکتا ہے اس کا نام اقبال ہو، مگر بالا خود کو بالا ہی کہتا ہے اس کا کہنا ہے کہ علامہ اقبال دے ہوندے میرے ورگا اقبال وی ہوئے تے درلغت، ''لعنت کہنے کے بعد یہ اسی بات پر اصرار کرتا ہے کہ اُسے صرف بالا ہی کہا جائے۔ اور اسی بات کو دہراتا ہے کہ اُسے بالے کے نام سے ہی پکارا جائے سب چھوٹے بڑے اُسے بالے کے نام سے ہی مخاطب کرتے ہیں اور خود بالا اپنے تمام ملنے والوں کو کسی کو بھی نام سے پکار لیتا ہے۔

اگر کسی دن بالے کے اڈے پر کچھ شور شرابا ہو رہا ہو تو سمجھ جائیں کہ آج بالے کی دھلائی کا دن ہے، اور یہ دھلائی کا دن مہینے میں دو تین بار ضرور آتا ہے، اور اس کی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ آج بالے نے کسی بزرگ خاتون کو میری منی کہہ دیا ہے یا کسی بزرگ مرد کو کاکا کہہ کر قہقہہ مارا ہے، جس کی وجہ سے یہ زبانی مار پڑ رہی ہے، بالا موچی 1947 میں اپنے گاؤں کے کسی شخص کے ساتھ پاکستان آیا تھا، اس وقت اس کی عمر دس سال تھی، اس نے آتے ہی گلی کے شروع میں نالے کے کنارے ہی ایک چوڑے سے کونے پر ایک لکڑی کا صندوق اور ایک ٹوٹی پھوٹی کرسی رکھ کر قبضہ جما لیا تھا، رفتہ رفتہ اس نے دو تین ٹاٹ کی بوریاں بچھا کر اپنے بیٹھنے کا انتظام کیا جوتوں کی مرمت کرنے والے تمام اوزار خریدے اور باقاعدہ ایک سلیقہ شعار بندے کی طرح، موچی کا اڈا بنا لیا۔ شروع شروع میں یہ جیسی بھی سلائی کرتا، کوئی اعتراض نہ کرتا کہ نیا بچہ ہے کام سیکھ رہا ہے اور بالا یونہی کام کرتا رہا۔

بالے کا معمول ہے یہ صبح سویرے اپنے اڈے پر آجاتا ہے، پہلے اردگرد باقاعدہ جھاڑو دیتا ہے پھر پانی کی ایک ہودی میں لگے کارپوریشن کے نلکے سے ڈول میں پانی لاتا ہے اور چھڑکاؤ کرتا ہے، گلی کے ساتھ ہی بڑی سڑک پر رش ہونے سے پہلے پہلے بالا، اڈا تیار کر لیتا ہے اور خود بھی نلکے پر خوب صابن

اعجاز رضوی

لگا کر نہاتا ہے اس کا کہنا ہے چہڑے نوں چنگا پانی لاؤ تاں جے اور نرم رہے" بالے کو اپنی خوبصورتی سے بہت لگاؤ ہے، اسی لیے خود بھی بنا سنوارہ رہتا ہے اور دوسروں کو بھی خوبصورتی کی داد دیتا ہے، مگر کبھی کبھی اس معاملے میں دھوکا بھی کھا جاتا ہے اور پھر اپنی غلطی کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ سننے والے حیران بھی ہوتے ہیں اور خوش بھی۔ بالے کا کہنا ہے کہ ایک بار اس نے بہت ہی خوبصورت لڑکی دیکھی تو اس نے اپنی عادت کے مطابق جی اوئے سوہنی سسی، ہیر کہا اور ابھی ہیر کا لفظ پورا بھی نہیں کہا تھا کہ سامنے سے ایک بھرپور تالی کی آواز آئی اور ساتھ ساتھ، آئے ہائے مر جانے تجھے میں ہی نظر آئی" تیرا بیڑا غرق ہو، تیری ماں سسی ہو، تیری بہن ہیر ہو، اور تو خود سوہنی کا ابا ہو اور پھر مسلسل تالیوں نے بالے کو شرمندہ کر دیا، کسی نے بالے کی حالت دیکھتے ہوئے کہا یار بالے پہلے دیکھ لیا کر پھر تعریف کیا کر، بالے نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا لو دسو اپنی مشقت" پہلے چیک کرو پھر تعریف کرو، نالے سب دے سامنے کسی نوں چیک کرنا اچھا وی نئیں لگدا، مشورہ دینے والا پہلے تو ہنسا پھر بالے کے ایک دھپ لگایا، اور بالے کا قہقہہ اور ساتھ او معاف کرو جی، معاف کرو جی کی صدائیں بلند ہوتی رہیں بہت سے بے تکلف لوگ بالے کو بالا پیڈل بھی کہتے ہیں۔ اور پوچھتے ہیں کہ بالے تجھے بالا پیڈل کیوں کہتے ہیں۔

تب بالا بہت سنجیدہ ہو کر کہتا ہے کہ بس جی اک تے ایڈی گئی دوجے نام پڑ گیا ہوا۔ ایسے کہ میں امرت سر کے ایک گاؤں سے باہر دوستوں کے ساتھ کھیل رہا تھا کہ میں نے گاؤں والوں کو بھاگتے دیکھا تو بھی میں گھر کی طرف بھاگا تو گاؤں کے ایک بزرگ شخص نے مجھے پکڑا اور بھاگنا شروع کر دیا، میں نے بہت زور لگایا کہ یہ شخص مجھے چھوڑ دے مگر اس نے مجھے نہیں چھوڑا، کچھ دور جانے کے بعد، اس نے مجھے چھوڑا اور بتایا کہ گاؤں پر حملہ ہو گیا ہے کچھ لوگ مارے گئے اور کچھ بھاگ گئے ہیں۔ میں نے جب یہ سنا تو واپس گاؤں کی طرف بھاگا مگر چند دوسرے بھاگتے ہوئے لوگوں نے مجھے پھر پکڑ لیا، اور بتایا کہ تیری ماں کو حملہ کرنے والوں نے مار دیا ہے، ابھی یہ بات ہو رہی تھی کہ درختوں کے پیچھے سے ایک شخص نے کلہاڑی ماری تو میری ایڈی کٹ گئی، لوگوں نے مجھے کیمپ لے جا کر مرہم پٹی کی اور یوں میں گاؤں والوں کے ساتھ لاہور آ گیا، کچھ دن تو گاؤں والوں نے ساتھ رکھا پھر رفتہ رفتہ وہ لوگ پتہ نہیں کہاں چلے گئے اور میں اکیلا رہ گیا اکیلے پن کو دور کرنے کے لیے میں نے اس پانچ فٹ کے اس زمینی ٹکڑے پر قبضہ کر لیا، اور اُسکو اپنا گھر اور اپنا کارخانہ بنا لیا، لوگوں نے اعتبار کیا محلے والوں نے اپنا سمجھا یوں گھر گھر میں بالا بالا ہو گئی۔ خیر جی چھڈو، تسی دسو بوٹ اے یا جوتی، پالش ہے یا مرمت، وڈ کم اے تے کل آؤ چھوٹا کم اے تے کرسی تے بے جاؤ، ویسے بالے کی دعوت پر اگر کوئی کرسی پر بیٹھ جائے تو بالا

بڑے فخر سے کہتا ہے تو میں تہانوں کرسی تے بٹھا دیتا اے، مُن تُسی، ہلنا نئیں ورنہ نالے وچ گئے واقعی کئی بار ایسا ہوا بھی کے لوگ کرسی پر بیٹھے اور کرسی سمت نالے میں جا گر، اور بالا قہقہے لگا تا رہا اور گرنے والا گالیاں دیتا رہا، بالے کا کہنا ہے کرسی دی کوئی ضمانت نہیں۔

بالے کو گلی محلے کے بچوں سے بہت پیار ہے، اور جب بچے اس کو بالا کہتے ہیں تو یہ خوش ہو جاتا ہے اگر کوئی بچہ اس کو بالا انکل یا چاچا بالا کہہ دے تو یہ ناراض ہو جاتا ہے اور کہتا ہے اوئے، وڈے انگریز دے پتر، میں بالا واں، اپنے پیو کول پچھ لے، نالے فیر کدی انکل چاچا ماما کیا تے سمجھ تو گیا، اس کے اس انداز سے اکثر بچے ڈر جاتے ہیں، مگر کچھ دلیر بچے اُس کو جواب میں موچی انکل کہہ کر بھاگتے ہیں تب بالے کی حالت دیکھنے والی ہوتی ہے اور یہ با آواز بلند کہتا ہے اور اپنی ماں تے پترا، کجھ پڑھ لے، لکھ لے، لے میرے کولوں کتاباں لے جا۔ ان پڑھا،

بالے کو کتابیں پڑھنے کا بہت شوق ہے، اس کا کہنا ہے کہ میری ماں نے مجھے پڑھنا لکھنا سکھایا تھا کے میں نے یہ کارخانہ چلانا تھا۔

بالے کا کہنا کہ میرے پاس کچھ اسلامی اور کچھ جاسوسی ناول ہر وقت ہوتے ہیں اور علامہ اقبال کی بانگ درا تو ہر وقت پاس ہوتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ بڑی عمر کے کاکے اور چھوٹی عمر کی مائی یہ کتابیں ضرور پڑھیں تاکہ کاکے کو بڑا ہونے اور مائی کو چھوٹا ہونے میں زیادہ مشقت نہ کرنی پڑے، بالا دیکھنے میں موچی

ہے پر اپنی حالت، اپنی باتوں، اپنے اخلاق، اور اپنے تعلقات سے بالکل موچی نہیں لگتا محلے کی تقریبات میں شرکت کرتا ہے اور سب سے وعدہ کرتا ہے کہ وہ بھی جلد ہی سب کو اپنے گھر بلائے گا مگر آج تک کسی نے بالے کا گھر دیکھا ہے نہ ہی کسی کو معلوم ہے کہ بالا کہاں رہتا ہے، اسی سے پوچھو تو کہتا ہے کہ ساری زمین اللہ کی ہے، بس امرت سر کو چھوڑ کر، اگر وہ بھی زمین اللہ کی ہوتی تو میں وہاں ہوتا، میری ماں بھی ہوتی، میرے بہن بھائی بھی ہوتے پورا گاؤں ہوتا، مگر چلو جی سوہنے رب نوں جو منظور میں تے راضی آں، بالے کو اپنے اڈے سے بہت پیار ہے، یوں بھی اس نے اس کو اتنا صاف ستھرا رکھا ہوا ہے کہ کوئی بھی وہاں بیٹھنے میں عار نہیں سمجھتا، بالا جوتے مرمت کرتے ہوئے، اکثر آتے پر فقرے بازی کرتا ہے کوئی سوٹ بوٹ میں ہو تو بالا کہتا ہے، اج تے وحید مراد دا بھیرا نا مرادی لگ رہیا ایں کوئی بال بنا سنوار کے آئے تو کہتا ہے اوئے ماشاء اللہ اج تے ولیپ کیار یاد آ گیا کوئی جوان خاتون بنی سنواری جا رہی ہو تو کہتا ہے تینوں دیکھ کے اپنی بڈھی ماں یاد آ گئی، اس کے فقرے بازی کا جواب کوئی بھی نہیں دیتا کہ سب کو پتہ ہے کہ یہ بالا نہیں بالا پیڈل اے یہاں صرف بالا ہی نہیں سب پیدل ہی پیڈل ہیں اور پیڈل نے تو اوپر نیچے ہونا ہی ہے کہ یہ اوپر نیچے کا سفر ہی اصل زندگی ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

ماہیے

آنگن کو سجایا نہیں
بادل تھا وہ ساون کا
پھر لوٹ کے آیا نہیں

.....

کوئی دیس گلابوں کا
کیوں توڑ دیا تو نے
شیشہ میرے خوابوں کا

.....

روشن اک تارا ہے
کیوں روٹھ گئے ساجن
کیا دوش ہمارا ہے

.....

نہ نیند نہ سپنا ہے
آ اب لوٹ چلیں
وہ دیس تو اپنا ہے

.....

جیون تو فسانہ ہے
منزل ہے دور میری
پر لوٹ کے جانا ہے

.....

سیا چین کو جا کاگا
ہے دور میرا ڈھولا
پیغام پہنچا کاگا

.....

راتوں کو نہ سوئی میں
جب دیس ہوا ٹکڑے
دل بھر کے روئی میں

.....

دریا کا ساحل ہے
یہ درد جدائی تو
اک عمر کا حاصل ہے

سیما پیروز

قطعات

مخیّر

بے حسی کی چٹان ، تھی نگری
زندگی کی غریب ، نے جس میں
کیا مخیّر نہ تھے ، محلے میں؟
خودکشی کی غریب نے جس میں

رواداری

نہیں شدت کہیں اس میں نہیں ہے
یہ چاہت پیار، الفت کا امیں ہے
روا داری کو شاید ، تو نہ سمجھا
مرا اِسلام ، حکمت والا دیں ہے

لفظی لذت

بات سیدھے سبھاؤ ، ہر اپنی
پھیر ، عاصم بخاری تھوڑی ہیں
لفظی لذت کے واسطے اپنے
شعر، عاصم بخاری تھوڑی ہیں

مقصد

اپنے دنیا میں ، آنے کا مقصد
کاش! غافل یہ بھول، مت جاتا
کاش! انساں بھی اس شجر جیسے
کام مخلوق کے ، تری آتا

اِک بیٹا

بھاری آتے نہ ، اتنے "نیل بجلی"
آرے دل پر نہ اپنے یوں چلتے
بیٹا اک واپڈا ، میں بھی ہوتا
ہاتھ افسوس کے ہیں اب ملتے

آنکھوں

تو ہے شہ کار ، واقعی کوئی
ہائے رخسار کا ، یہ تِل توبہ
تیری آنکھوں کو دیکھ ، کے دلبر
توڑ دیتا ہے روز ، دل توبہ

مہنگائی

اتنی مہنگائی ، الاماں توبہ
بجلی آئے پہ جان ، جاتی ہے
ایسے احوال اب کے ہیں اپنے
فیض کی نظم یاد ، آتی ہے

عاصم بخاری

ہائیکوز

پاکستانی دھرتی پہ
رشوت لینے والوں کو
جینے میں آسانی ہے

داغ مٹانا مشکل ہے
اب تیرے دروازے پر
میرا آنا مشکل ہے

یوں تابندہ رہتے ہیں
اچھا شعر سنانے والے
برسوں زندہ رہتے ہیں

کیسی گیم بنائی ہے
قاتل بھی یہ پوچھے گا
کس نے آگ لگائی

کیسا فون سنایا ہے
مہندی والے ہاتھوں پر
کس نے خون لگایا ہے

غم کا چارہ پوچھیں گے
تجھ سے میرے بارے میں
لوگ دوبارہ پوچھیں گے

وہ میرا ہر جائی ہے
اُس نے باتوں باتوں میں
منہ پہ بات سنائی ہے

رُخ اپنا یوں موڑا ہے
تم نے اپنی مرضی سے
رشتہ مجھ سے توڑا ہے

محمد طلحہ غفور

خلا کی تسخیر

خلا کی تسخیر کرنے والو
سنا ہے تم چاند دیکھ آئے
کئی ارب ڈالروں کے بدلے
قمر کی مٹی سمیٹ لائے

.....

خلا کی تسخیر کرنے والو
قمر کی تسخیر صد مبارک
جو خواب آدم کو تم نے بخشی
وہ زندہ تعبیر صد مبارک

.....

خلا کی تسخیر کرنے والو
یہ کارنامہ عظیم تر ہے
تمہاری ان کوششوں سے قائم
صداقتِ عظمتِ بشر ہے

.....

خلا کی تسخیر کرنے والو
بتاؤ کیا تم نے یہ بھی سوچا
تمہاری دنیا کا حال کیا ہے؟
زمیں پہ ہے ایک حشر برپا

.....

خلا کی تسخیر کرنے والو
کرو گے کیا مہ کی خلوتوں میں؟
ہزاروں انساں سسک رہے ہیں
تمہاری اپنی ریاستوں میں

.....

خلا کی تسخیر کرنے والو
دھواں زمیں سے نکل رہا ہے
دھماکے ایٹم کے ہو رہے ہیں
وجودِ انساں پگھل رہا ہے

.....

وہ دیکھئے قافلہ ہمارا
نجوم و مہ سے گزر رہا ہے
خلا کی تسخیر ہو رہی ہے
زمیں پہ انسان مر رہا ہے

سید فخر الدین بلے

حکایت

زندگی کا میلہ ہے
درد کا جھمیلا ہے

اور اس جھمیلے میں
ہر کوئی اکیلا ہے

زندگی کی راہوں پر
لوگ چلتے رہتے ہیں

رُخ بدلتے رہتے ہیں
زندگی کے دھارے کو

کون روک سکتا ہے!
روشنی کے منظر کی

ساعتوں کا مت پوچھو
خواب اور حقیقت کے

فاصلوں کا مت پوچھو
یاس اور ہزیمت کے

دائروں کا مت پوچھو
روشنی کی ساعت گو

مختصر سی ہوتی ہے
مختصر نہیں ہوتی
خواب کی رفاقت بھی
مختصر ہی ہوتی ہے

مختصر نہیں ہوتی
حُسن کی ولایت اور

درد کی حکایت میں
فرق ہے تو اتنا ہے

حُسن کی صداقت کو
چشمِ تر سے نسبت ہے

درد کی فراغت کو
بحر و بر سے نسبت ہے

سید افسر ساجد

غبارِ خجالت

یہ اپنی جھوٹی انا کے غلام نا انسان
لگا کے آگ جو گرجا گھروں کو نفرت سے
ردائے پیکرِ تہذیب پھاڑتے جائیں

غرور و کبر کے مارے یہ پاسبانِ حرم
کریہہ سوچ کی گدلاہٹوں کے چھینٹوں سے
ہمارے دین کا چہرہ بگاڑتے جائیں

یہ شیطنت کے پجاری حواس سے عاری
ہمارا قریۂ حاضر تو کر چکے برباد
ہمارے خواب نگر بھی اجاڑتے جائیں

بھگت رہے ہیں ہم ان کی رذالتوں کا کیا
کسی کے سامنے آنکھیں اٹھا نہیں سکتے
زمیں میں خود کو خجالت سے گاڑتے جائیں

علاج اب ہے یہی اِس عذاب کا عالی
نمو کی دھوپ اترنے نہ دیں جو صحنوں میں
وہ نا درخت جڑوں سے اکھاڑتے جائیں

جلیل عالی

حادثہ

دیوار پہ تیر بن گیا ہے
تصویر سرک گئی وہاں سے
آغاز نئے سرے کرو تم
انجام کا رخ بدل نہ جائے
پانی پانی ہوا ہے گھر کیا
دیوار پہ کیا لکھا گیا ہے
اک تیر ہے رنگ میں ترازو
تصویر پہ جبر سا ہے طاری
اس کو ہے مقام سے اترنا
کرچی کرچی سے یوں گرے گی
جس طرح جگر کی چوٹ کھائے
یہ لوگ گھروں کو جو سمجھ لیں

آصف ثاقب

---انتخاب---

- خالد احمد -

---نعمان منظور---

پانی اُتر گیا ، مگر آنکھیں بجھا گیا
سیلِ جمال اپنا نشاں تک مٹا گیا

کچھ تو کہیں

سکوت اچھا ہے، لب ہلنے ہلانے سے
بہت محفوظ رہتے ہیں
بھرم رہتا ہے بھیدوں کا
جو کھل جائیں، زبانیں گنگ ہو جائیں
بجا ہے احتیاط اچھی
رویہ چپ چپیتے کا
بڑی آسودگی کا موجب پیہم بھی بنتا ہے
مگر یہ بات سچی ہے
نہ بھولے، بھول کر کوئی
کہ جب بھی چپ میں استقلال آ جائے
لبوں کو بند رکھنے سے زباں کی ساکھ مر جائے
تو عرضِ مدعا کا کوئی بھی مظہر
جہانِ دید کے ہرگز نہ پاس آئے
سراسر دور ہو جائے
یہی بہتر ہے کچھ نہ کچھ
کہے جانا ہماری
جان بخشی کی علامت ہے
ارادے مضمحل ہو کر عذاب جان بن جائیں
تو موسم کے خزاں دیدہ نہ ہونے کی
رمق کوئی نہ رہ جائے
دلوں کی چاندنی کو اور دنوں کے سب اجالوں کو
اندھیرے نوچ ڈالیں گے
شجر ویران ہوں گے اور پرندے بھی
اڑ نچھو ہوتے جائیں گے
لہٰذا چپ کا روزہ توڑنا اچھا، نہ کچھ کہنے سے
کچھ کہنا بڑی راحت کا باعث ہے

سید ریاض حسین زیدی

امکان (نثری نظم)

رات کو پیدا ہونے والی تاریکی
روشنی کا مطالبہ کرتے ہُوئے گھبرا جاتی ہے
جسے غلامی نے جنم دیا ہو
وہ آواز آزادی کی صدا لگاتے ہُوئے
لڑکھڑا جاتی ہے
دیوار کا سہارا لے کر چلتے ہُوئے سائے میں
دِیے کی چاپ سننے کی سکت باقی نہیں رہتی
اُفق پر ڈوبتا ہُوا سورج
ہماری دن بھر کی جمع کی ہُوئی چنگاریاں
بجھائے دے رہا ہے
آؤ کچھ دیر کے لیے آنکھیں میچ لیں
اور اگلی صدی کے آنے تک
اپنا سر جسم سے الگ کر کے
حفاظت سے کسی غار میں رکھ دیں
ہو سکتا ہے ہماری خاک سے
نئی صدی کا سورج طلوع ہو جائے!

خاور اعجاز

نوحہ

(کرسچن چرچز اور کالونی کو آگ لگائے جانے پر)

ہمارے پرچم کا جتنا حصہ سفید تھا
سُرخ ہو گیا ہے
ہمارے پرچم کا جتنا حصہ بھی سبز تھا
زرد ہو چکا ہے
ستارہ اور ہلال بھی ماند پڑ گئے ہیں
رسولِ اکرم نے جو کہا تھا
ہمیں جو تعلیم دی گئی تھی،
وہ طاقِ نسیاں پہ رکھ چکے ہیں!
جناح و اقبال نے ہمیں جو سبق دیا تھا
بھلا چکے ہیں
ہم اپنی تاریخ کے درخشندہ نقش سارے
مٹا چکے ہیں!

.....

کوئی عبادت کدہ ہمارے لئے بھی مسجد
سے کم نہیں تھا
کجا کہ اس کو جلایا جائے
کسی کے گھر کو، کسی کی بستی کو راکھ کرنا
ہمارا مسلک کبھی نہیں تھا

.....

جو سبز پوشی ہمارا اعزاز تھا
اُسے خاک میں ملا کر
کئی عبادت گہیں جلا کر
گھروں کو کر کے سپردِ آتش
تمام انسانیت کو گویا
برہنگی کا لباس پہنا دیا ہے ہم نے
جو چاند چہرہ چمک رہا تھا، دمک رہا تھا
اُسی پہ مل دی ہے راکھ ہم نے
اُسی کو گہنا دیا ہے ہم نے!

نسیمِ سحر

تیری آنکھیں

تری آنکھوں کی رعنائی میں کیا شانِ الٰہی ہے!
قیامت کی سفیدی ہے، قیامت کی سیاہی ہے
شبِ دیجور کی ظلمت ہے، نورِ صبح گاہی ہے
غضب ہے ایک جا رُوم و حبش کی پادشاہی ہے

فرشتے برف کی چادر میں بادل رکھ کے لاتے ہیں
تری پلکوں کے نیچے بجلیوں کو یوں چھپاتے ہیں

تری آنکھیں شبِ تاریک کے روشن ستارے ہیں
فضائے عالمِ قدسی کے بے پروا شرارے ہیں
تری زلفیں تو ہیں کالی گھٹا، یہ برق پارے ہیں
نہیں، یہ آفتابِ حسن کی کرنوں کے آرے ہیں

اُتر کر دل میں پہلو کو جگر تک چیر جاتے ہیں
محبت کے لیے اِک آتشیں مندر بناتے ہیں

تری آنکھیں بلوری جام ہیں جو حکمِ داور سے
بھرے جبریلؑ نے جنت میں جا کر حوضِ کوثر سے
لگائی اِن میں آگ آئینہ گردوں کے جوہر سے
ہوئے یہ مست شعلے اُڑ کے ہم آغوش محشر سے

قیامت پھر رہی ہے تیری مستانہ نگاہوں میں
پڑی ہے ایک ہلچل سی جہاں کی بزم گاہوں میں

تری آنکھیں کنول کے پھول ہیں جو باغِ جنت میں
کبھی مانندِ کشتی تیرتے تھے آبِ رحمت میں
تبسم بن کے حوریں کھیلتی تھیں اِن کی خلوت میں
فرشتے ڈوب جاتے دیکھ کر نورِ مسرت میں

بہشتی کشتیاں اب حُسن کے پانی میں بہتی ہیں
تمنا بن کے رُوحیں عاشقوں کی اِن میں رہتی ہیں

تری آنکھیں ہیں دو چشمے شرابِ آسمانی کے
ہیں رقصاں جن کے آئینے میں جوہر دلستانی کے
شرر افشاں ہیں جلوے اِن میں حُسنِ جاودانی کے
جہانِ پیر کو نغمے سُناتے ہیں جوانی کے

یہ چشمے حُسن کے گلزار کو سیراب کرتے ہیں
محبت کے چمن کو خرم و شاداب کرتے ہیں

تری آنکھیں شرارِ برق ہیں گُم کردہ راہوں کو
گرا کر برقِ عصمت پھونک دے میرے گناہوں کو
نگاہوں میں مری ڈال اپنی نورانی نگاہوں کو
کہ دیکھوں اِن کے آئینوں میں قدسی بارگاہوں کو

مری ہستی محیطِ حُسن میں مستور ہو جائے
لگا کر نور میں غوطہ، سراپا نور ہو جائے

اکبر منیر

غرور

مہ و سال پر نہ غرور کر
تجھے اصلیت کا پتا نہیں
تجھے زندگی جو عطا ہوئی
وہ محیط تین دنوں پہ ہے
ترا عہدِ رفتہ ہے ایک دن
جو گزر گیا کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا
ترا آنے والا جو کل ہے وہ بھی ہے ایک دن
اسے عمر میں نہ شمار کر
کہ وہ آئے بھی تو یقیں نہیں
تجھے ذی حیات ہی پائے گا
ترے پاس ایک ہی روز ہے
جسے آج کہتے ہیں نکتہ داں
تری دسترس میں کچھ اور اس کے سوا نہیں
ترا کل اثاثہ ہے ایک دن
اسے غفلتوں میں گنوا نہیں
مہ و سال پر نہ غرور کر
تجھے اصلیت کا پتا نہیں

گلزار بخاری

تُو ہیر، مَیں تیرا رانجھن ہوں

تُو ہیر، مَیں تیرا رانجھن ہوں
تُو صاحباں مَیں ترا مرزا ہوں
تُو سوہنی ، مَیں مہینوال ترا
تُو شیریں ، مَیں فرہاد ترا
تُو لیلیٰ ، مَیں ترا مجنوں ہوں
تُو سسی ، مَیں ترا پنوں ہوں
تُو مومل ، مَیں ترا رانو ہوں
تُو لیلا ، مَیں چنیسر ہوں
تُو گل مکئی ، مَیں ترا موسیٰ ہوں
تُو درخانئی ، مَیں آدم ہوں
تُو شہی ، مَیں تیرا تورد لئی
تُو شیر بانو ، مَیں یوسف ہوں
تُو سمو ، مست توکلی مَیں
تُو مہرک ، مَیں ترا عزت ہوں
تُو ہانی ، مَیں شہ مُرید ترا
ماہناز تُو ، مَیں شہداد ترا
تُو جولیٹ ، مَیں ترا رومیو ہوں
تُو نگہت ، مَیں ترا ازہر ہوں

ازہر منیر

میڈیا ٹرائل.....

ہماری تمھاری ملاقات اَب
اِشتہاروں میں ہوتی ہے
ہوتی رہے گی
کسی پردۂ برق و باراں کی چوکور میں
کائناتوں کی اِن مشتہر منڈیوں میں
اِدھر سے ہمیں اور اُدھر سے تمھیں
عکس بندی کے اَسرار دے کر اتارا گیا ہے
ہمیں مطمئن کرنا پڑتا ہے
بازاروں بازاروں
بھٹکی ہوئی بھیڑ کو
بھیڑ جس کا بھلا نام خلق خدا تھا کبھی
اب کسی نام سے بھی پکارو
تو یوں چونک اٹھتا ہے مجمع میں ہر کوئی
جیسے اُسی کو بلایا گیا ہو
لپکتے ہیں لوگ
اپنے ٹی وی کا دروازہ توڑیں گے یکبارگی
اور گھس جائیں گے
نشریے کے مقابل میں مدِّمقابل
جہاں فلم کی بے ادب، بے لحاظ
ایڈیٹنگ ہو رہی ہو
اِشتہاروں میں اَب مشتہر کچھ بھی کیجے
یہ چھینٹے جو رہ رہ کے خبروں کے اڑتے ہیں
پڑتے ہیں اُن دامنوں پر بھی جو رہ میں
پڑتے نہیں ہیں
بڑا ظالم اِس حاشیے میں کھڑا کیمرا ہے
کوئی دانہ دانہ جگالی کرے
تھال کو جس طرح سے بھی خالی کرے
کوئی پوروں کی پوشیدگی میں
عبادت کا رخ موڑ دے
توڑ ڈالے پپوٹوں کی اِک جھرجھری سے
خدا کی چھڑی
کھونٹی پر لٹکتی ہوئی لاش کو بھی یہ جا چھیڑتا ہے
ہمارا تمھارا کفیل اِس طرف کیمرا
اُس طرف کیمرا
ہماری تمھاری ملاقات اَب نشریاتی
اِداروں کی رہداریوں میں
نکیلی، کٹیلی اداکاری کرتے ہوئی ہے
تو ہوتی رہے گی

یونہی بے سروپا
کسی حادثے میں کہیں جیتے مرتے
کسی واقعے کا کبھی پانی بھرتے
اِدھر سے ہمیں اور اُدھر سے تمھیں آنا پڑتا ہے!
معلوم ہے
ایک ایسا بھی اندھیر ہے
ایسا بھی پھیر ہے
جس میں ہم آتے ہیں
تم نہیں آتے ہو
دور سکرین پر کچھ بھی آتا نہیں
ایسی مشہوری کوئی چلاتا نہیں!!

شاہین عباس

راکھ

اویس الحسن

ان کے ہاتھوں میں وہی تیغِ ستم تھی لیکن
بعد صدیوں کے نمی آنکھ کی دیکھی نہ گئی
ہم نے پھر اپنی وفاؤں کو کیا تھا مصلوب
ناز پیکر میں کمی ہم سے ہی دیکھی نہ گئی
ہم سے پھر درد کہانی کی طلب ہے کس کو
کس نے بجھتی ہوئی پھر راکھ کریدی دل کی
کس نے زخموں پہ سرِ شام نمک سا چھڑکا
کس نے چپ چاپ سی اک شام وہ زخمی کر دی
جس کو معلوم نہ ہو بھاؤ تمناؤں کا
خواب نگری سے گزرنے کی سزا ملتی ہے
پھول مرجھائے ہوئے ملتے ہیں تو آنکھوں کو
اشک دریا کے بپھرنے کی سزا ملتی ہے
لفظ سادہ ہی سہی پھر بھی سمجھنے کے لئے
بات ظرفوں کے بدلنے سے بدل جاتی ہے
جیسے اک تیز برستی ہوئی بارش میں ادھر
بوند آنکھوں سے چرانے کو غزل جاتی ہے
جی میں آتا ہے کہ خود اپنی کہانی سن کر
ختم کر دیں اسے دیوار میں زندہ چن کر

اضطراب

بحر کے تلاطم پر
جب ہوائیں شوریدہ
آسماں گرفتہ ہو
بادلوں میں ہلچل ہو
اور زمین لرزیدہ
جانے کیوں یہ لگتا ہے
ساری بے کلی ان کی
اضطراب میرا ہے

وحشتوں کے گھنگرو پر
میری آنکھ کی پتلی
رقص کرتی رہتی ہے
بے گرفت لمحوں پر کسمساتی رہتی ہے
اضطراب جنتی ہے
بے نشان کروٹ میں

آنکھ سے نکلتی ہے
کان میں اترتی ہے
اور زباں سے کہتی ہے
ہاں بساطِ دنیا پر زندگی تو مہرہ ہے
بے ثبات منظر میں
آندھیوں کے سینے پر
کانپتا بسیرا ہے
روشنی اندھیرا ہے
اب تو بے کلی مری
اس طرح تڑپتی ہے
جیسے ایک دلہن سے
بیوگی لپٹتی ہے

فرخندہ شمیم

کھڑکی سے جھانکتی نظم

وحشت تو پھر وحشت ہے نا
وحشت کے آنے سے پہلے
یہاں کبھی
اک ہنستا بستا شہر تھا
جس میں
ہر موسم کے پھول اگتے تھے
خوشبو اڑتی پھرتی ہے
یوں لگتا تھا
تجھ سے ملنے جانے والے
ہر رستے پر
پھول بچھے ہیں
رنگ سجے ہیں
اب تو جیسے
شہر میں
بس اک میرا گھر ہے باقی
گھر بھی کیا ہے
جلتے، بلتے صحرا میں
اک کھنڈر ہے
جس کی
دیواریں خاموش کھڑی ہیں
دروازے پر چپ کا تالہ
روشن دان میں جالا
اور کھڑکی میں لوکا پہرہ
باہر نہ وہ پھولوں والے
رستے ہیں
نا خوشبو
حد نظر تک
روح جھلساتی ریت
جو کھڑکی سے ٹکرائے
تو لگتا ہے
جیسے کوئی جھانک کے
واپس لوٹ گیا ہو

اوصاف شیخ

کارِ دنیا مفادات کا کھیل ہے

آج کل سوچتا ہے یہی ہر کوئی
صرف اس سے تعلق کروں استوار
فائدہ جس سے ملنے کی امید ہو
اور کنارہ کروں ایسے ہر شخص سے
جو کسی کام آنے کے قابل نہیں

ہر کوئی بس اسی سوچ میں غرق ہے
کیسے دولت کا انبار اکٹھا کروں
اک طلسماتی ٹوپی ہو سر پہ مرے
جھوٹ بولوں تو سب اس کو سچ مان لیں
میرا دھوکہ کسی کو دکھائی نہ دے
اور نظروں سے اوجھل رہے ہر فریب

دوستی اب تو بس کام کی رہ گئی
رشتے ناطے بھی اب نام کے رہ گئے
ڈھونڈھنے سے بھی اخلاص ملتا نہیں
صرف مادہ پرستی کا ہی راج ہے

اپنے اطراف نظریں تو دوڑائیے
کوئی مخلص اگر ہے تو بتلائیے
منفعت کی لڑی میں پروئے ہوئے
ایک دھاگے میں سب ہیں سموئے ہوئے

اور وہ دھاگہ فقط ہے مفادات کا
اور دنیا اسی کا ہی تو کھیل ہے

سرور حسین نقشبندی

من وسلویٰ کا ہوائی رُخ

دل افروز چہروں کی
سجل باتوں کا نور
آبِ حیات کے چشمے سے بہہ کر
خیال کی صحرائی وسعت میں
کہیں دفن ہو جاتا ہے

ہم سمندر پہ مرتسم
نقرئی لہروں سے
خاکہ نگاری کا فن سیکھتے ہیں
کشتیاں
ہمیں مصائب میں جینے کا حوصلہ دیتی ہیں
مچھیرے
بے دلی سے
آوازوں کے جال بچھا کر
نئی روحوں میں من وسلویٰ کا صور پھونکتے ہیں

ہم لہجے کی بازگشت میں
لفظ کے نئے استعمال کا ہنر سیکھتے ہوئے
کیوں یقین سے تہی
روایت کے پرانے ترازو کی ڈنڈی کو
ہوا میں معلق رکھتے ہوئے
سمجھوتے کی نفسیات سے جی بہلاتے ہیں

کاش ہمیں
مٹی کی خوشبو
خود سے لیپ دیتی
دیارِ غیر کے جھونکوں میں
بیگانگی
بے رُخی کا ابنارمل رویہ ہے
اِسے ترک کرتے ہوئے
خوشبوؤں کا اِک ناقابلِ تسخیر جہاں آباد کرتے
جسے دُنیا دیکھتی
مگر ہم تو۔۔۔ سفر کی لکیروں کے گرداب میں پھنسے
اٹلس کا ہوائی رُخ دیکھتے ہیں

امجد بابر

نثری نظم

زندگی مجھے وقت کی شاہراہ پر رکھ کر بھول گئی ہے

آتی جاتی سانسیں

ہونے کا گیان مانگتی ہیں

میرا ہونا نہ ہونے سے زیادہ مس ٹیریس ہے

میں نے خود کو کئی بار اپنے سامنے گزرتے

وقت کے پیچھے بھاگتے دوڑتے دیکھا ہے

لگتا ہے مصروف ہوں

میرا وجود ناتمام خواہشات کے سومنات پر ایستادہ

محبت کے چڑھاؤ کا منتظر رہتا ہے

اب کوئی دل کے معبد میں نہیں جھانکتا سرسری

ملاقاتوں کے لئے ہی وقت کب میسر ہے

باتیں سینوں میں ادھوری رہ جائیں گی

زباں تالو سے لگی ہے

لفظ ہی ادا نہیں ہو پاتے کہیں

کوئی ہم زباں نہیں ملتا

مجھے اس صدی سے رخصت ہو جانا چاہئے

کمپیوٹرائیج کی

آرٹی فیشل انٹیلی جینس

کے لئے شائد میرا وجود مس فٹ ہے

اور غیر ضروری بھی

امکان ہے پسندیدہ محبتیں ماضی

قریب میں آرٹی فیشل انٹیلی جینس سے

تیار کی جا سکیں گی

آدمی آدمی کے لئے ضروری نہیں رہا

نائلہ راٹھور

بیمار گلاب

(William Blake کی نظم "The Sick Rose" کا منظوم اردو ترجمہ)

بہت زیادہ ہے بیمار تُو، گلاب کے پھول!

وہ ایک کیڑا

جسے دیکھ ہم نہیں سکتے

ہمیشہ رات کو

اُن آندھیوں میں اڑتا ہے

جو چیختی ہیں

جو سر مار مار روتی ہیں

اُسی نے تجھ کو بنایا ہے اپنی نرم سی سیج

وہ سیج، جس کی ہوئیں مِلک

قِرمزی خوشیاں

اور اُس کی معمولی مختصر محبت

جو سیاہ کالی ہے اس نے بڑھ کر

تری شگفتہ، حسیں زندگی

تباہ کی ہے

غلام مرتضیٰ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

بے حس کسی خنکی سے پگھلتے نہیں خالد

اے ماں! ترے بیٹے ترے اشکوں پہ کھڑے ہیں

مختصر نظمیں

ماں تو بچپن میں مر گئی میری
اب مرے ساتھ اک دعا بھی نہیں

ہائے! یہ زیست کا سفر کوکی!
کٹ گیا ہے مگر کٹا بھی نہیں

.....

میں بھی اس کو دیکھ کر حیران تھی
وہ بھی مجھ کو دیر تک ،تکتا رہا

تھا پریشاں حال کوکی شخص وہ
لگ رہا تھا۔۔۔ مدتوں تنہا رہا

.....

ہوں پریشان، کیا کروں، نہ کروں
آج بے حد دکھا ہوا ہے دل

جانے کیا کیا ، غلط ہوا مجھ سے
الجھنوں میں ، پڑا ہوا ہے دل

کوکی گل

نظم

محبت کا میں خُوگر ہوں، وفاداری کا پیکر ہوں
میں پاک جذبوں میں وفاداروں کا ہمسر ہوں

مِرے اعمال سارے میرے چہرے پر ہی لکھے ہیں
میں باہر جو نظر آتا ہوں، اُس سے بڑھ کے اندر ہوں

مِرا ہمسر زمانے میں کوئی بھی ہو نہیں سکتا
میں خود اپنے مقابل ہوں، میں خود ہی اپنا ہمسر ہوں

مجھے تنہا سمجھ کر مجھ سے لڑنے مت چلے آنا
میں تنہا ہو کے بھی ہمّت میں اک جرّار لشکر ہوں

مجھے چُھو کر اگر دیکھو، حَریرو پَرنیاں ہوں میں
اگر ٹھوکر لگاؤ گے تو اک سنگین پتھر ہوں

مِری غزلیں، مِری نظمیں وفا کا اِستعارہ ہیں
میں حسن و عشق کا داعی، محبت کا پیمبر ہوں

شہاب اللہ شہاب

یہ کیسا اضطراب ہے.....

یہ میرے تیرے مختصر سے
اجنبی جہان کا
جو تھا تو اک خیال میں
وہ تھا بھی یا نہیں مگر
حسین اختتام ہے۔۔۔
حسین اختتام ہے؟؟؟

نہیں نہیں، یہ اک نئے جہان کے
طویل سے عذاب کا حسیں سا مقام ہے
تو کیا یہ اضطراب ہے؟

مرے بدن نے قرب کی
اذیتوں سے ماورا ترے حسیں وجود کی
حرارتوں کی چاہ میں
بُنے ہیں جو خیال سب، یہ ان کا ایک جال ہے!
یہ میری اس زبان سے
فقط مرے ہی کان نے
سنے ہیں جو مکالمے،
یہ ان کا ایک خواب ہے!

طویل سے عذاب کا حسیں سا مقام ہے
حرارتوں کی چاہ میں شرارتوں کا جال ہے
حقیقتوں سے ماورا فقط یہ ایک خواب ہے
یہ سچ میں اضطراب ہے؟؟؟

یہ واہموں کی دوڑ ہے!
یہ اس جہاں کے عارضی، طویل سے مقام پہ
عجب سے مسخروں کی اک طویل سی قطار میں
تری ہنسی کا شور ہے۔۔۔

یہ واہموں کی دوڑ ہے؟؟؟
یہ تجھ حسیں شباب کے حسین گُل بدن سے جو
فضا میں اک خمار ہے، اسی کا یہ سراب ہے!

مقام ہے نہ جال ہے، نہ خواب ہے نہ واہمہ
نہ کوئی اضطراب ہے،
حقیقتوں کی الجھنوں پہ مستقل پڑا ہوا
جواب تلک میں لکھ چکا، غزل کا اک سراب ہے

میں ہوں تو اک عذاب ہوں!
تُو ہے تو اک سراب ہے!

اسامہ احمد

برِ اعظم سے برُے اعظم تک

[جہاں تم ہو/جہاں میں ہوں]

جہاں تم ہو

وہاں کی چاروں سمتیں ہی تمھاری ہیں

وہاں ویران راستے پر بچھا سبزہ

تمھاری چاپ سن کر ''ویل کم'' کہتا ہوا

پاؤں میں پچھتا ہے تو

ٹھنڈک دل پکڑتی ہے

جہاں تم ہو

وہاں ''گڈ مارننگ'' کا صاف مطلب ہے

کہ اب دن بھر تمھیں گڈ ہی ملے گا

جہاں تم ہو

وہاں ''سوری'' کا مطلب ہے کہ تم افسوس کے کوہ گراں کو

سامنے والے کے شانوں پر دھرو اور خود سبک سر

بھیڑ سے آگے نکل جاؤ

جہاں تم ہو

وہاں، ''ہائے'' کا مطلب ہے

کہ سب کچھ ٹھیک ہے کل کی طرح سے آج بھی موج طرب جذبے

جگائے گئی

بریک اپ ہو بھی جائے تو نیا رشتہ بنائے گی

جہاں تم ہو

وہاں پر ''آئی لو یو'' ایک فقرہ ہے

جسے کوئی بھی اپنی آنکھ اپنے ہونٹ اپنی ادھ کھلی بانہوں سے

فوری کہہ بھی سکتا ہے

جہاں میں ہوں یہاں اک بیل نے میری زمیں کو اپنے نوکیلے سینگوں

پر لا در کھا ہے

کہیں پر بیل رکھتا ہے نہ یہ دھرتی سنبھلتی ہے

مسلسل ڈولتا گرتا سنبھلتا میں کسی آواز کو

سننے سے قاصر ہوں

میری گڈ مارننگ، سوری، میری ہائے ہیلو سب کچھ

سنہرے سبز رستے سے گزر کر، ایک دھندلی ملگجی

ویران پگڈنڈی پہ بیٹھی ہے

میں اس سے دور بیٹھا بیل کی رفتار کو قابو میں کرنے کی

کوئی آیت کوئی منتر کوئی ٹونہ بنانے کی مشقت میں پڑا بے حال زندہ ہوں

میرے اطراف میں بیٹھے سبھی انسان میرے کاغذ قلم کو دیکھ کر، اپنا

مددگاری سمجھتے ہیں

مگر میں بیل کی رفتار کو قابو میں کرنے کا کوئی ہتھیار رکھتا ہوں

نہ منتر ہی کوئی از بر ہوا مجھکو

میں دھرتی کا شناسا ہوں مگر یہ بیل قابو میں نہیں آتا

میرے اطراف میں بیٹھے تھکے ہارے بشر مجھ سے

بڑی امید رکھتے ہیں

مگر میں خود کسی کی یاد میں ڈوبا بساط ہجر پر اچھے دنوں کو جیتنے کی چال چلتا

ہجر کی چابک سے ڈرتا ڈوڑتا ہوں، ہجر کی جانب لپکتا ہوں

میں ناکارہ نہیں ہوں بس چھہتر سال کی پیدل مسافت کی تھکن

اوڑھے پڑا ہوں، اور بس آواز سنتا ہوں

جہاں تم ہو وہاں پر میں نہیں اک شور ہے ڈیسکو ہے ڈالر ہے

جہاں میں ہوں یہاں

روٹی کے پیچھے بھاگتے لاکھوں بشر گریہ کناں ہیں اور یہ دھرتی مرکھنے

بیل کی رفتار سے عاجز کسی معجزنما کی منتظر ہے

اعجاز رضوی

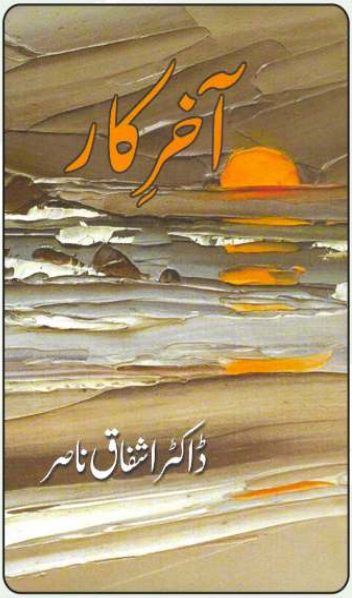
آخرِ کار
ڈاکٹر اشفاق ناصر

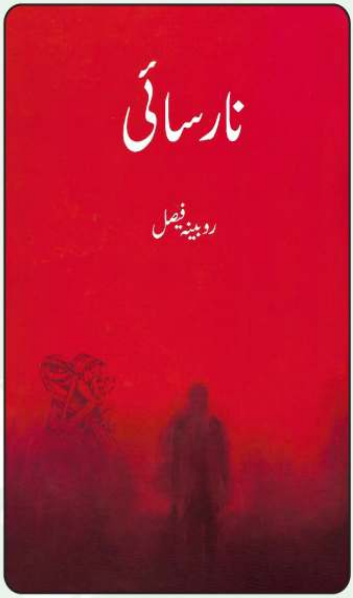
نارسائی
روبینہ فیصل

زندگی کہانی ہے
افسانے
اجمل اعجاز

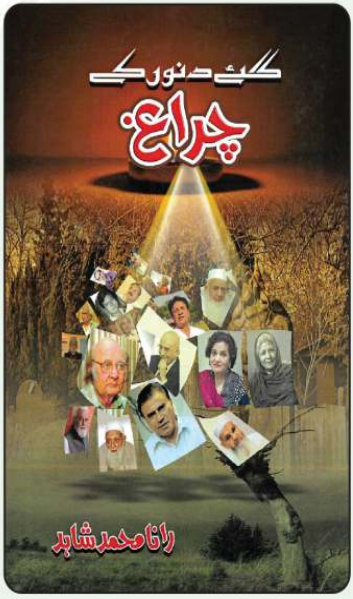
گیت دنور کے
چراغ
رانا محمد شاہد

محترمہ سلمیٰ اعوان، محترمہ منصورہ احمد اور جناب احمد ندیم قاسمی

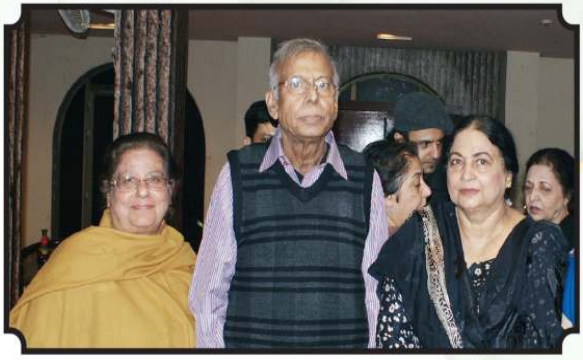

محترمہ بلقیس ریاض، جناب خالد احمد اور محترمہ سلمیٰ اعوان

محترمہ بلقیس ریاض، محترمہ نیلم احمد بشیر، محترمہ رخشندہ نوید، محترمہ سیما پیروز، جناب شعیب بن عزیز اور محترمہ سلمیٰ اعوان